طلبہ کا سالانہ ادبی رسالہ

نمود

شمارہ ۶، ۲۰۱۷ء

مدیر: اسداللہ خان

مدیرِ منتظم: ملک محمد رمضان

نائب مدیران: محمد عمر حبیب، عبدالوہاب نیاز

LUMS

گرمانی مرکزِ زبان وادب

لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز

فہرست

اداریہ

مضامین

حضرت رابعہ بصریؒ	احمد جاوید	(ادیب و دانشور)	۷
اقبال اور نیٹشے	مہروز بن ایوب	(طالب علم لمز)	۲۳
اقبال کا تصورِ زمان و مکان	طلحہ علی مدنی	(طالب علم لمز)	۴۸
انتظار حسین اور کافکا کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ	ظفر علی حبیب	(طالب علم لمز)	۵۹
سماجی مسائل اور منٹو کے افسانے	یسریٰ جمیل	(طالبہ لمز)	۶۳
محسن نقوی: ''بجھ کر بھی نشانِ رہِ منزل تو رہوں گا''	عبدالوہاب نیاز	(طالب علم لمز)	۷۳
منٹو کے دو کرداروں ''سلطانہ'' اور ''سوگندھی'' کا موازنہ	آئمہ افضل	(طالبہ لمز)	۸۰
پیاری کٹی: این فرینک کی ڈائری کے چند اوراق (ترجمہ)	زینب خواجہ	(طالبہ لمز)	۸۴

افسانہ / تخلیقی نثر

کس کا ڈر ہے	فیضان صفدر علی	(طالب علم لمز)	۸۸
غسل	عشا نصرت	(طالبہ لمز)	۹۵
اُس پار	عائشہ جمیل	(طالبہ لمز)	۹۹
دائرہ	ثانیہ سلطان	(طالبہ لمز)	۱۰۳
بنتِ حوا	حافظ محمد عمیر مظہر	(طالب علم لمز)	۱۰۹
بلاعنوان	ذیشان دانش خان	(ریسرچ ایسوسی ایٹ)	۱۱۸

شاعری/غزلیات

وہ درمیان سے نکلا تو یہ کھلا مجھ پر	حارث بلال	(طالب علم لمز)	۱۲۱
کہاں کہاں کوئی دیوار تھی، نظر رکھنا	حارث بلال	(طالب علم لمز)	۱۲۲
صبر کے پیروں میں چھالے، راستے، بے تاب دن	سردار علی حسن	(ریسرچ اسسٹنٹ)	۱۲۳
تھکے ہیں پاؤں اور اب جھکی ہے نظر	محمد علی اشرف	(طالب علم لمز)	۱۲۵
ان ملاقاتوں میں آخر، شوقِ حسرت کیوں نہیں؟	وکش اویس	(طالب علم لمز)	۱۲۶

نظمیں

''میں'' کی صدا	عبدالوہاب نیاز	(طالب علم لمز)	۱۲۷
حرف، معانی اور ذات	اسداللہ خان	(طالب علم لمز)	۱۲۹

رپورتاژ

پاکستان: میرا تجربہ	ربیکا ہڈ انک راچ	(طالبہ لمز)	۱۳۱
لمز میں لوھا کُٹ اسٹیج کیا گیا	زاہد حسن	(ریسرچ ایسوسی ایٹ)	۱۳۶
ڈاکٹر سیّد عبداللہ: ایک صدی، ایک عہد	زاہد حسن	(ریسرچ ایسوسی ایٹ)	۱۳۸
گرمانی مرکز زبان وادب کے زیر اہتمام سہ روزہ صوفی کانفرنس: (۱۲ تا ۱۴/اپریل ۲۰۱۷ء)	ذیشان دانش خان	(ریسرچ ایسوسی ایٹ)	۱۴۰
شعری تجربہ: ممتاز شاعرہ یاسمین حمید کا لیکچر	زاہد حسن	(ریسرچ ایسوسی ایٹ)	۱۴۲
گرمانی مرکز زبان وادب کے حلقۂ دانش کے زیرِ اہتمام پنجابی صوفی شعرا پر لیکچر سیریز	زاہد حسن	(ریسرچ ایسوسی ایٹ)	۱۴۴

مصاحبہ (انٹرویو)

حاجی عبدالقیوم کاکڑ کے ساتھ ایک نشست	سردار علی حسن	(ریسرچ اسسٹنٹ)	۱۵۰

اداریہ

مجھے یہ الفاظ سپردِ قلم کرتے ہوئے بے انتہا مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ گرمانی مرکزِ زبان و ادب نے لمز میں ادب کے فروغ کے لیے جو پودا لگایا تھا، وہ اب آہستہ آہستہ بار آور ہو رہا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی طلبہ کا سالانہ ادبی مجلّہ نمود بھی ہے۔ چھے برس پر محیط خوب سے خوب تر کی اس جستجو میں نمود کے پانچ شمارے شائع ہو چکے ہیں اور اب چھٹا شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ اس میں شامل تنقیدی اور تخلیقی تحریریں لمز کے طلبہ کے اعلیٰ ادبی ذوق کی عکاسی کرتی ہیں۔

اگرچہ نمود کے حالیہ شمارے میں شامل بیشتر نگارشات، گذشتہ شماروں کی طرح، لمز کے مختلف شعبہ ہائے علم سے تعلق رکھنے والے طلبہ کی ہیں، تاہم اس شمارے کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل کئی تنقیدی اور تخلیقی مضامین ایسے طلبہ کی کاوش ہیں جن کی اُردو ادب سے واقفیت بالکل ابتدائی نوعیت کی ہے۔ اس ضمن میں ایک جرمن اسٹوڈنٹ ربیکا ہڈانک راچ (Rebecca Hadank-Rauch) جو اسٹوڈنٹس ایکسچینج پروگرام (Students Exchange Program) کے تحت لمز میں زیرِ تعلیم رہیں، ان کی تحریر ''پاکستان: میرا تجربہ'' نہایت اہمیت کی حامل ہے، جس میں ربیکا نے پاکستان اور اُردو زبان سے اپنے بڑھتے ہوئے تعلق کی جڑیں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایسی تحاریر کے علاوہ ممتاز شاعر، ادیب اور فلسفی احمد جاوید صاحب کا حضرت رابعہ بصریؒ کی شخصیت پر دیا گیا خصوصی خطبہ بھی شاملِ اشاعت ہے، جس نے اس شمارے کی اہمیت کو دوچند کر دیا ہے۔ میں نمود کے ادارتی بورڈ کی جانب سے تمام طلبہ کو ان کے ادبی کام کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں، اور امید رکھتا ہوں کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا نئے سے نئے پیرایوں میں اظہار کرتے رہیں گے۔

آخر میں کچھ ایسی شخصیات کا ذکر ضروری ہے جن کی معاونت اور ذاتی دلچسپی کے بغیر شاید یہ شمارہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ پاتا۔ ان میں گرمانی مرکزِ زبان و ادب کے ڈائریکٹر جناب معین نظامی صاحب سرِ فہرست ہیں جن کے زیرِ سایہ یہ شمارہ تکمیل کو پہنچا۔ ہم گرمانی مرکز سے منسلک اساتذۂ کرام ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر ضیاء الحسن اور خصوصاً جناب احمد بلال صاحب کے بھی نہایت ممنون ہیں، جو اس شمارے کی تکمیل کے ہر ہر مرحلے پر ہماری رہنمائی کے لیے موجود رہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ہم گرمانی مرکز میں ریسرچ ایسوسی ایٹ (Research Associate) جناب ذیشان دانش کے بھی شکر گزار ہیں، اور اپنے ادارتی بورڈ کے ممبران عبدالوہاب نیاز، محمد عمر حبیب اور مدیر منتظم ملک رمضان کے بھی تہِ دل سے شکر گزار ہیں جنھوں نے ادارت کے ہر ہر صبر آزما موڑ پر ایک با اعتماد ٹیم ہونے کا ثبوت دیا۔ ان کے علاوہ سرِ ورق کی تیاری میں لمز کے طالبِ علم محمد لاروش اور کمپوزنگ کے حوالے سے گرمانی مرکزِ زبان و ادب کے معاون محققین ندیم اقبال اور نوشیروان ندیم کی کاوشیں بھی قابلِ ستائش ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ نمود کا یہ شمارہ بھی آپ کے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان بہم پہنچائے گا۔ اُمید ہے کہ آپ مجلّے کے معیار سے متعلق ہمیں اپنی قیمتی آرا اور تجاویز سے آگاہ کرتے رہیں گے۔

اسد اللہ خان

احمد جاوید

حضرت رابعہ بصریؒ

[گرمانی مرکزِ زبان وادب، لمز کے حلقۂ دانش کے تحت ۲۰۱۱ء کے خزاں سمیسٹر میں نمائندہ مشرقی شاعرات پر لیکچرز کے ایک سلسلے کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں ایک لیکچر اسلامی تصوف کی تاریخ کی عظیم صوفی شاعرہ حضرت رابعہ بصریؒ پر بھی ہوا اور یہ لیکچر معروف مذہبی اور ادبی اسکالر جناب احمد جاوید صاحب نے دیا۔ اب یہ لیکچر تحریری شکل میں آپ کے سامنے ہے۔]

حضرت رابعہ بصریؒ ایک دین دار مگر غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ اپنے نہایت پاک باز اور خوددار والد کے زیرِ سایہ پروان چڑھیں۔ اس دوران ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ اُن کے والد، اسمٰعیل صاحب کے پاس بچوں کو کھلانے کے لیے تین چار دن سے کوئی سامان نہ رہ گیا تھا۔ ایک دوست نے انھیں پیش کش کی کہ تم مجھ سے کوئی مدد لے لو، مگر انھوں نے واضح لفظوں میں انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے! ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر آپ وہ واقعہ پڑھیں اور اس میں اُن کے انکار کا اسلوب دیکھیں، تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ انسان کی اخلاقی عظمت اور اس کا جذبۂ خودداری اُسے مزید منکسر المزاج کس طرح بناتا ہے۔ شِکوہ سا ہوتا ہے جو آدمی سے دعوے کرواتا ہے، سخت گیری سے انکار کرواتا ہے مگر اسمٰعیل صاحب کے انکار میں ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ انھوں نے پوری عاجزی، نیازمندی اور ممنونیت کے ساتھ کہا کہ تم تو یہ پوچھ کر ہی میرے محسن بن گئے ہو، لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس ان شاء اللہ ایک ذریعہ ہے جس کو استعمال کر کے میں اس تکلیف سے نکل جاؤں گا اور تمھیں بھی اطلاع کر دوں گا۔

اُس زمانے میں بصرے کے گورنر بھی ذاکر، شاغل اور نیک آدمی تھے۔ یہ بھلے زمانے تھے کہ جب ریاست کے تمام کل پرزے پورے کے پورے خراب نہیں ہوتے تھے۔ اُن میں کچھ کچھ نمونے نیکی کے ملتے تھے۔ گورنر بصرہ کا

ایک معمول تھا کہ وہ جمعہ کی شب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کچھ معین مقدار میں درود شریف پڑھا کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، رابعہ بصریؒ کے والد اسمٰعیل صاحب کے خواب میں تشریف لائے اور آپ نے فرمایا کہ تم ایسا کرو کہ امیر بصرہ کے پاس جاؤ اور کہو کہ پچھلے جمعے تمھارا درود شریف مجھ تک نہیں پہنچا، اب اس کا ہرجانہ یہ ہے کہ چار ہزار دینار وہ تمھیں دے دے اور تم وہ چار ہزار لے کر اپنا کام چلاؤ۔ یہ امیرِ بصرہ کے پاس تشریف لے گئے اور اُسے جا کر اپنا خواب سنایا۔

اب یہ امیرِ بصرہ کا بہت ہی ذاتی شغل تھا کہ وہ شبِ جمعہ کو ایک خاص مقدار میں درود شریف پڑھتے تھے۔ جب اسمٰعیل صاحب نے انھیں خواب سنایا تو وہ بہت شرمندہ ہوئے لیکن شرمندگی کے ساتھ ساتھ اُنھیں ایک فخریہ خوشی بھی ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنھیں یاد تو رکھا۔ انھوں نے پورا پیغام سن کر کہا کہ چار ہزار دینار آپ کی نذر ہوئے اور دس ہزار دینار میں شکرانے کے بانٹ رہا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے لیے آپ جیسا قاصد بھیجا۔ یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ خاندانی ماحول تھوڑا سا ہمارے سامنے آجائے جس ماحول میں رابعہ بصریؒ کی پرورش ہوئی تھی۔

اس کے بعد ایک واقعہ جوان کی زندگی میں بہت بڑے انقلاب کا سبب بنا، وہ یہ ہے کہ والدین کے انتقال کے بعد وہ ایک قافلے کے ساتھ کہیں سفر پر جا رہی تھیں۔ اس عہد کا ایک چلن تھا کہ قافلوں پر ڈاکو ٹوٹ پڑتے تھے۔ ڈاکوؤں نے وہ قافلہ بھی لوٹ لیا۔ مردوں اور قافلے والوں کی اکثریت کو غلام اور کنیز بنا کر بازار میں بیچ دیا۔ ان بکنے والے غلاموں اور کنیزوں میں رابعہ بصریؒ بھی تھیں۔ اُس زمانے کے رواج کے مطابق غلاموں اور کنیزوں کی منڈیاں لگتی تھیں۔ وہاں سے رابعہ بصریؒ کو بھی ایک شخص نے خرید لیا اور ان سے زرخرید کنیزوں جیسے کام لینا شروع کر دیے۔

رابعہ بصریؒ کو اس شخص کے گھر میں نہایت سخت کام سرانجام دینے پڑتے۔ ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ یہ رات کو اللہ کے حضور نوافل ادا کر کے مناجات کر رہی تھیں۔ ان مناجات کا خلاصہ یہ تھا کہ:

اے میرے رب میں تجھے اپنا محبوب بنا چکی ہوں۔ میں تیرے آگے موجود رہنا بھول

چکی ہوں۔ میں تیری طرف ایسی یکسوئی کا عزم کر چکی ہوں کہ مجھے تیرے سوا کوئی کچھ نہ دے۔ میں تجھ سے ایک ایسا معاملہ کر چکی ہوں کہ مجھے تیرے سوا کسی سے کام نہ پڑے۔لیکن شاید تیری مرضی اسی میں ہے کہ تو نے بظاہر مجھے اپنے ایک بندے کا غلام بنا رکھا ہے۔ میں اس پر شاکی نہیں ہوں لیکن اس آقا کی خدمت میں جتنا وقت میں اس مصلّے سے دور رہتی ہوں اس پر میرا قلق، میرا دکھ قبول فرمالے۔

رابعہ بصریؒ یہ مناجات کر رہی تھیں کہ ان کے مالک کی کسی وجہ سے آنکھ کھل گئی۔ وہ ٹہلتا ہوا ادھر آیا تو ان کی آواز اور مناجات کے کلمات اس کے کان میں پڑے۔ سچے آدمی کی آواز زلزلے سے کم نہیں ہوتی۔آدمی اگر سچا ہو تو اس کا کلام زلزلہ ہے جو اچھی زمین کو بھی ہلا دیتا ہے اور بری زمین کو بھی تہ و بالا کر دیتا ہے۔پس رابعہ بصریؒ کی یہ مناجات اُس شخص کے لیے زلزلے کی طرح ثابت ہوئیں اور اس نے مناجات ختم ہونے کا ادب سے انتظار کیا۔ جب یہ خاموش ہوئیں تو وہ کمرے میں داخل ہو کر ان کے قدموں میں گر گیا اور کہا کہ بی بی مجھے معاف کرنا کہ میں تمھارا مرتبہ نہیں پہچانتا تھا۔ میں نے تمھارے ساتھ بہت سختیاں، زیادتیاں اور بے ادبیاں کی ہیں۔ میں ان سب کی معافی چاہتا ہوں۔اب یا تو تم یہ قبول کرلو کہ میں تمھیں اپنی مالکن بنا کر تمھاری غلامی کے فرائض ادا کروں۔یعنی تم اس گھر میں مالکن بن جاؤ اور میں تمھارا نوکر بن کر زندگی گذاروں، دوسری صورت یہ ہے کہ تم چاہو تو آزاد ہو جاؤ۔ رابعہ بصریؒ نے جواب دیا کہ نہیں بھائی! مخلوق کا غلام بننا اور مخلوق کا آقا بننا ایک ہی جیسی بات ہے؛ ان دونوں میں ذلت ایک جیسی ہے۔ مجھے تو آزادی چاہیے۔ چنانچہ اُس شخص نے رابعہ بصریؒ کو دست بستہ آزاد کر دیا۔

آزاد ہوتے ہی انھوں نے لوہے کے اس ٹکڑے کی طرح جس پر عارضی زنگ جھاڑ دیا گیا ہو اور وہ اپنے مقناطیس کی طرف لپکے، اسی لپک، اسی کشش اور اس رفتار کے ساتھ صحرا کا رُخ کیا اور وہاں جا کر اللہ کی عبادت اور ریاضت کے لیے مکمل خلوت اختیار کی جو کئی برس پر محیط رہی۔کچھ عرصہ گذرنے کے بعد اس زمانے کے بعض بڑے صوفی بزرگوں کو ان کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ زور دے کر انھیں شہر میں واپس لے آئے۔شہر میں واپس آ کر لوگوں کے لیے ان کی حیثیت گویا ایک روحانی ماں جیسی ہوگئی؛ ظاہر ہے پھر ان

کی عوامی زندگی بھی شروع ہوئی۔ یہ رابعہ بصریؒ کی وہ سوانحی (biographical) معلومات ہیں جن کو جاننا ضروری ہے۔

جو گفتگو میں کرنا چاہ رہا تھا اب اس کا آغاز کر رہا ہوں۔ یہ اُس زمانے کا بصرہ ہے جب دوسری صدی ہجری میں اسلام اپنے تہذیبی آئیڈیلز میں کمزور ہونے لگا تھا اور ریاستی ڈھانچے کی تعمیر میں صَرف ہوتا جا رہا تھا۔ جب کوئی مذہب اپنی ساری قوت ریاست کے ہاتھوں میں دے چکا ہو تو پھر اُس کے ماننے والوں کے اندر کچھ منفی رجحانات پھیلنے کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اس زمانے کی مذہبیت میں سب سے بڑا رویہ یہ پیدا ہوا کہ اللہ ڈرنے کی چیز ہے۔ بندگی اطاعت کا نام ہے۔ اللہ کی اطاعت یعنی فرماں برداری اور بس۔ اللہ حکم دینے کی مشین ہے اور بندہ حکم پر چلنے کے لیے ایک روبوٹ ہے۔ اطاعت اور خوف کا نمونہ گویا مذہبی ذہنیت کا مرکزی نقطہ بن گیا تھا۔ جیسا کہ ہم اپنے تجربے سے بھی جانتے ہیں کہ اطاعت کسی کی بھی ہو، وہ جبر ہوتی ہے۔ اگر اللہ سے تعلق صرف اطاعت کا ہو تو یہ تعلق نفس کے لیے بھی ناگوار ہو جاتا ہے۔ انسان دراصل اس تعلق میں اپنی قبولیت اور اپنائیت کو پیدا کرنے والا قرب چاہتا ہے۔ مگر اس جبری مزاج نے اللہ کے ساتھ تعلق کی فطری، روحانی، اخلاقی اور نفسیاتی ضرورت کی پیدائش کا راستہ روکنا شروع کر دیا تھا۔ اس ماحول میں رابعہ بصریؒ غالباً سب سے پہلی صوفی آئیڈیل اور اصلی مذہبی نمونے کے طور پر ظاہر ہوئیں۔ یعنی ماحول یہ تھا کہ جہاں اللہ سے تعلق حکم اور فرماں برداری تک محدود رکھا جا رہا تھا تاکہ بادشاہ کے اقتدار کو قائم ہونے کے لیے چند نفسیاتی بنیادیں مل جائیں، ایسے ماحول میں رابعہ بصریؒ کا ظہور میرے خیال میں ایک صوفی آئیڈیل کا ظہور تھا۔

بعض شخصیات اپنے سوانحی اور حیاتیاتی پیکر (biological structure) سے بالاتر ہوتی ہیں، یعنی ان کو اپنی اہمیت اور بڑائی ثابت کرنے کے لیے خاص قسم کے اقوال، افعال اور واقعات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ وہ شخصیات ہوتی ہیں جو آئیڈیل کی طرح حرکت (move) کرتی ہیں، یعنی یہ ایک نئے نظام الوجود کی بانی بن جاتی ہیں۔ یہ تاریخ میں اپنی تعلیمات کے تسلسل کے لیے نہیں اُٹھی ہوتیں بلکہ انسان کے لیے وجود کا ایک نیا سانچا بن کر خود کو ظاہر کرتی ہیں۔ رابعہ بصریؒ بھی اس دور کے بصرہ میں وجود کا ایک نیا سانچا بن کر، بندگی کا ایک تازہ نمونہ بن کر، اور اللہ سے تعلق کا ایک نیا طریقہ بن کر ظاہر ہوئیں۔ یہ ان کی اصل اہمیت ہے جو ان کے بارے میں ہماری تاریخی معلومات کی کمی کو ان کی قدردانی (appreciation) کے راستے میں رُکاوٹ نہیں بننے دیتی۔ حضرت رابعہ بصریؒ تصوف کی اصطلاح میں

طریق عشقی کی ایک بانی ہیں۔ ممکن ہے کہ 'طریقِ عشقی' ایک نامانوس اور مشکل لفظ ہو اس کی وضاحت میں ابھی کروں گا۔

ایک سوال اللہ پر ایمان رکھنے والے ہر ذہن میں پیدا ہوتا ہے، ایک مسئلہ اللہ سے تعلق رکھنے والے ہر بندے کی تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ تعلق میں وہ راستہ کون سا ہے جو میرے کُل وجود کی تسکین کر دے۔ اس کُل وجود کی تسکین کو ایک گروہ اطاعت کے پیرائے میں سمجھتا ہے جب کہ دوسرا گروہ محبت کے دبستان میں دیکھتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ اس دور میں اطاعت کا پیرایہ مذہبی شعور اور نفسیات پر غالب آنا شروع ہو چکا تھا۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے محبت کا راستہ کھولنے کی جو ضرورت تھی جو یقینی طور پر حضرت رابعہ بصریؒ کی ذات سے، اور ان کی ذات میں کھلا۔

تو میں بی بی رابعہ بصریؒ کے حوالے سے جو باتیں طریقِ عشقی پر کہنا چاہتا ہوں اُن کا جواز میں ان کی ایک نظم سے پیدا کروں گا۔ یہ نظم ذرا دیکھ لیجیے تا کہ ہم اس گفتگو کو پھر آگے بڑھائیں۔ ویسے نظمیں میرے پاس تین ہیں جن میں سے ایک ابھی عرض کر رہا ہوں، باقی دو آخر میں پیش کروں گا۔ ان کی بس چار یا پانچ نظمیں ملتی ہیں اور ان میں سے بھی ایک دو کے بارے میں یہ لگتا ہے کہ یہ ان کی نہیں ہیں کیونکہ ان میں کچھ ایسی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں جو ان کے بہت بعد وضع ہوئیں۔ بہر حال ہمارے خیال میں جو نظمیں یقیناً ان کی ہیں، وہ تین میرے پاس ہیں۔ ذرا یہ نظم دیکھیے۔ نظم کیا ہے، بس نظم کا نثری ترجمہ ہے:

''محبوبِ من'' (میرا محبوب)

میری شانتی اے میرے بھائیو اور بہنو!

میری تنہائی ہے

یہ ایسی لائن ہے کہ جسے دو تین مرتبہ صرف زبان سے ادا کرنے سے آدمی کے اندر کی دھند چھٹ جائے کہ میری شانتی میری تنہائی، اور تنہائی بھی ایسی جو خود مجھ سے خالی ہو۔ تنہائی ہمیشہ ملاوٹ زدہ رہے گی جب تک تنہا رہنے والے کو خود کا شعور ہو گا۔ اصل تنہائی وہ ہے جس میں انسان خود سے بھی خالی ہو۔ ''اے میرے بھائیو اور بہنو'' کا جملہ بیچ

میں لا کر بی بی قاری کو یہ باور کروانا چاہ رہی ہیں کہ میں یہ تنہائی تم سے لاتعلقی، نفرت یا عداوت کی بنیاد پر اختیار نہیں کر رہی۔تم میرے لیے پسندیدہ ہو؛ میرے پیارے ہو؛ مجھ سے چند مضبوط اور اٹل نسبتوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہو۔ میری شخصیت کا یہ حصہ تم سے ٹوٹا ہوا نہیں ہے۔لیکن میری تنہائی میری شخصیت کا انکار کر کے مجھے وجود کی ایک ایسی فضا میں لے جاتی ہے جہاں تمھاری نفرت اور محبت دونوں غیر حاضر ہیں۔ اطمینان اور سکون کہتے ہی محبت اور نفرت کی کشاکش سے پاک ہونے کو ہیں۔ جہاں محبت اور نفرت میں تصادم ہوگا وہاں اطمینان وسکون نہیں ہوگا۔ میری محبت مجھ پر کچھ نفرتیں واجب کرتی ہے اور میری نفرت مجھ سے کچھ محبتوں کا تقاضا کرتی ہے۔یعنی یہ اطمینان وسکون کی دشمن ہیں؛ اور پھر سب سے بڑا دشمن میں خود ہوں۔ جب تک میں خود پر مسلط ہوں اس سے بڑا عذاب کیا ہوگا؟ یعنی میں ایک حیاتیاتی انا (biological ego) کا قیدی بن کر اپنے لیے اپنا تعارف بن جاؤں اور خود پر مسلط ہو جاؤں، اس سے بڑی بے اطمینانی اور بے سکونی اور کیا ہو سکتی ہے؟ نتیجہ یہ کہ درحقیقت میری شانتی میری تنہائی ہے۔

میرا محبوب ہمیشہ میرے ساتھ ہے

یہ وہ تنہائی ہے جہاں محبوب ہمیشہ میرے ساتھ ہے۔محبت کا مان لینا اس شخص کو جائز نہیں ہے جو محبوب کی محبت کو اپنی شخصیت سے آزاد ہو کر experience اور contain نہ کرتا ہو۔"میرا محبوب ہمیشہ میرے ساتھ ہے۔" یعنی تنہائی وہ ہے جو محبوب کو ساتھ رکھنے کا ظرف ہے وہی میری شانتی ہے۔

میں پا نہیں سکتی اس کی محبت کا کوئی بدل

کیا کہنے، اس کا کیا مطلب ہوا؟ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی محبت مجھے ایسی مل جائے جو اس کی محبت کی طرح ہو یا اس کی محبت پر غالب آ جائے۔نہیں! یہ کہہ رہی ہیں کہ میرا دوسرا محبوب ہو ہی نہیں سکتا۔نظریہ بدل لیا: فائدہ ہو سکتا ہے، نقصان بھی ہو سکتا ہے؛ تصور تبدیل کر لیا: فائدہ بھی ہو سکتا ہے، نقصان بھی ہو سکتا ہے۔لیکن اگر محبوب بدل لیا تو اس سے بڑی کوئی مصیبت کسی فرد یا کسی قوم پر کیا آ سکتی ہے کہ اس کا محبوب بدل دیا جائے۔محبوب بدلنے کا مطلب تو سب چیزوں سے دست بردار ہو جانا ہے۔ وہ کہہ رہی ہیں کہ میں محبوب نہیں بدل سکتی۔اب دیکھیے جس زمانے میں وہ یہ کہہ رہی ہیں اس زمانے میں محبوب بدلنے کی مشق کی جا رہی تھی جو ہمارے دور تک آتے آتے مکمل اور کامیاب ہو گئی۔

وہ کہہ رہی ہیں کہ میں تمھاری طرح محبوب بدلنے کی مشق نہیں کر سکتی۔ نہ راحت مجھ سے محبوب کو بدلوا سکتی ہے اور نہ تکلیف مجھ سے محبوب کو تبدیل کروا سکتی ہے۔

فانی لوگوں اور عارضی چیزوں میں اُس کا عشق

میرا امتحان ہے۔

امتحان یہاں بہت بامعنی لفظ ہے۔ امتحان محض آزمائش نہیں ہے۔ امتحان کا مطلب ہے وہ واحد راستہ جو میرے وجود کے کھرے پن کو اُبھارے۔ فانی لوگوں اور عارضی چیزوں میں میرے محبوب کا عشق مجھے میسر آیا ہے تاکہ میں اعتباری وجود سے وجودِ حقیقی (authentic being) بن جاؤں، یعنی میرے وجود کی ملاوٹ زائل ہو جائے اور اس کا کھرا پن اُبھر کر سامنے آجائے۔

جب بھی میں دھیان جماتی ہوں اس کے جمال پر

وہ ہی میری محراب ہے اور اسی کی طرف ہے میرا قبلہ

محراب اور قبلہ کی عرفانی معنویت یہ ہے کہ تعلق اگر اللہ کے پہلو سے ہو تو علامت ''محراب'' ہے۔ یعنی اللہ نے اگر اپنا حضور (presence) عطا فرمایا ہے تو اس حضور کا ظرف (local of presence) محراب ہے؛ اور اگر اس حضور کو مجاہدے سے حاصل کرنے کی تگ و دو کی جائے اور اس تگ و دو کے نتیجے میں وہ حضور اللہ عطا فرما دے تو اس حضور کا ظرف ''قبلہ'' ہے۔ اس کو تصوف کی اصطلاح میں ''جذب اور سلوک'' کہتے ہیں۔ وہ حضور جو divine attraction سے ملتا ہے، ''محراب'' ہے؛ اور وہ حضور جو مجاہدے اور سلوک سے حاصل ہوتا ہے، اس کا مظہر ''قبلہ'' ہے۔ یعنی جذب ہو یا سلوک، دونوں کا پھل ایک ہے۔ یا اللہ! جس درخت کو تُو نے سیراب کیا ہے اور جس پودے کو میں نے اُگایا ہے، ان دونوں کا پھل ایک ہے۔ اگر عشق سچا ہو تو محبوب جو بڑی سے بڑی چیز عطا کر دے وہ چیز پہلے سے عاشق کو حاصل ہوتی ہے۔ عطا کرنے کا عمل صرف اُسے ظاہر کرتا ہے، کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔ عشق محبوب کے وصال سے بڑھتا نہیں ہے۔ محبوب جب خود کو عطا کر دیتا ہے تو بھی عشق میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

اگر میں مر جاؤں عاشق کی موت، دل کے اطمینان اور

روح کی سرشاری کو مکمل کرنے سے پہلے
تو افسوس ہے میری دنیاوی پریشانی پر

یعنی دل کا اطمینان اور روح کی سرشاری اس لیے مکمل نہیں ہوئی کہ میں دنیا سے متعلق رہا؛ اور شرمندگی ہے میرے دکھ پر کہ یہ خالص نہ رہا۔

اے روح کے زخموں کو بھر دینے والے
دل اپنی چاہ سے سیراب ہے
تجھے پالینے کی لگن میری روح کے روگ کا علاج ہے

دل اپنی چاہ سے سیراب یعنی دل اپنے آپ سے پروان چڑھ رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یا اللہ! تُو جو کچھ دیتا ہے اُس کا ذوق تُو نے مجھے پہلے سے دے رکھا ہے اور تجھے پالینے کی تڑپ ہی تجھے پانے کے بعد حاصل ہونے والے سکون کا پیش خیمہ ہے۔ یعنی تجھے حاصل کر لینے کے بعد کا سکون اور تجھے پانے کی تڑپ میں مزاج اور معنی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔

اے میری کبھی ختم نہ ہونے والی سرخوشی
اور اے میری ابدی حیات
تُو ہی سوتا میری زندگی کا
اور تجھی سے پھوٹی ہے میری سرمستی
میں نے جدا کر لیا خود کو سب مخلوق سے

اس مصرعے میں رابعہ بصریؒ نے اپنا منشور بیان کیا ہے۔ اس ''مَیں'' میں ان کی ذات بھی شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ خود بھی مخلوق ہیں تو اس کا لحاظ رہے کہ میں نے دوسروں سے تو خود کو جدا کیا ہی ہے، خود سے بھی جدا ہو گئی ہوں۔

تیرا وصل میری آرزو ہے
یہی منزل ہے میرے شوق کی

رابعہ بصری صاحبہؒ جس تصورِ محبت کو لے کر اُٹھی تھیں، اور جو بعد میں تصوف میں ایک بہت بڑے دبستان کی

بنیاد بنا، وہ نظریۂ عشق اس نظم میں بہترین طریقے سے بیان ہوگیا ہے۔ بیان ہوا وہ اس طرح کہ ''حُب'' جس سے لفظ محبت نکلا ہے اس کے اصل معنی ہیں پانی کا پیالے میں سے چھلک پڑنا یعنی باہر آجانا۔ تو ''حُب'' کا پہلا مطلب ہے کہ اپنے آپ سے چھلک پڑنا، اپنے آپ سے باہر نکل آنا۔ اسے اب میں اپنی تسکین کے لیے تھوڑا سا فلسفیانہ رنگ دینا چاہوں گا۔

ہمیں اپنے موجود ہونے کے لیے یا اگر ہم بامعنی انداز میں گہرائی سے موجود ہونا چاہتے ہیں، تو اس مہم میں، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی شخصیت کو اور اپنی انا کی حدود کو بدلتے رہیں۔ ہم خود کو روزانہ ایک نئی ego اور ایک نئی انا کے ساتھ define کرتے رہیں۔ یہ محبت ہے جو ایک ''انا'' سے چھلانگ لگا کر دوسری ''انا'' تک پہنچنے والی مسلسل حرکت ہے۔ اب آپ رابعہ بصریؒ کی اس نظم میں، اور اس سے آگے بھی جو نظمیں پڑھی جائیں گی، اُن میں بھی آپ دیکھیں گے کہ ان کے یہاں اپنا شعور یعنی ''میری''، ''میرا'' اور اس طرح کے دیگر الفاظ کا استعمال ہر سطح پر بہت زیادہ ہے۔ یہ جو ''میری'' اور ''میرا'' ہے یہ گویا انسان کے مرکزِ انا (ego centre) کے بدلتے رہنے کا ایک مسلسل عمل ہے۔ ان شاء اللہ اگلی دو نظموں میں ہم اسے مزید واضح کریں گے۔

رابعہ بصریؒ کا مذہبی شعور کی روایت میں بھی ایک بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے انسان اور خدا سے تعلق میں ترقی کا نہ صرف ایک نیا عملی اصول دریافت کیا بلکہ اس کا اطلاق بھی کر کے دکھا دیا۔ وہ نیا اصول یہ تھا کہ اپنی ذات تک محدود رہے بغیر اپنی تعمیر کرتے چلے جاؤ۔ یہ وہ پہلا اصول ہے جس کو میں نے عرض کیا کہ وہ ''انائیں'' بدلتے رہنے کا عمل ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ اللہ سے تعلق کا اصل ہدف اس کا احساس میں بدل جانا ہے۔ اس نکتہ کو میں ابھی واضح کرتا ہوں۔

یہ رابعہ بصریؒ کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ تعلق کے لیے فطری طور پر درکار احساسات اور کیفیات generate کر کے دکھا دیں۔ اللہ سے اس تعلق کی اتنی اہمیت تو ہوگی کہ ان کا یہ کارنامہ بہت بڑا معلوم ہوگا۔ یعنی اللہ سے تعلق چند تصورات تک محدود رہنے اور چند اعمال میں صرف ہو جانے والی چیز نہ رہے بلکہ یہ میرے احساسات کی پیدائش کا واحد سبب بن جائے۔ تعلق کی فطرت کیا ہے؟ اچھا اور برا لگنے کا سارا عمل اس تعلق کی بنیاد پر ہو،

تب تعلق مکمل ہوتا ہے۔تو رابعہ بصریؒ نے آ کر یہ بتایا کہ اللہ سے تعلق میں سچائی اور کمال کے لیے ضروری ہے کہ اللہ محض ایک تصور بن کر نہ رہ جائے، اللہ فقط ایک حاکم وآمر بن کر نہ رہ جائے بلکہ یہ لازم ہے کہ اللہ اپنی شانِ محبوبیت کے غلبے کے ساتھ میرے قلب میں اس طرح حاضر رہے کہ میرا پورا نظامِ احساسات اس کی محبت سے پیدا ہو۔ یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ آگے چل کر اس روایت نے اللہ سے تعلق کے فریضے کی انجام دہی میں ایک انتہائی بے مثل کردار ادا کیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ تہذیبی نفسیات اور انفرادی شعور میں جس حد تک بھی اب زندہ حالت میں حاضر ہے، یہ اس روایت کا ایک فیضان ہے۔

حضرت رابعہ بصریؒ کا تیسرا کارنامہ ذرا liberal قسم کا ہے۔انھوں نے مذہبی ذہن اور مذہبی معاشرت میں پیدا ہو جانے والی صنفی تخصیص یعنی عورت اور مرد کی تفریق (gender division) کو توڑ دیا۔ مذہبی ذہن اور مذہبی معاشرت خواتین کے بارے میں کچھ بے لچک سا مؤقف اختیار کر چکا تھا۔یعنی یہ کہ دین کی مرادوں کا فعال وسیلہ (active tool) مرد ہے، اور دین کی مرادوں کا غیر فعال سرا (passive end) عورت ہے۔ ہماری مذہبی نفسیات یا سوچ کچھ اس طرح کی بن چکی تھی یا بنتی جا رہی تھی۔ اس کے تحت کسی بھی طرح سے مرکزی کارنامے کو انجام دینے کی گنجائش خواتین کے لیے نہیں رہ گئی تھی۔ ایسے میں یہ خاتونِ اعظم اُٹھتی ہے اور مردوں کو ان کے سب سے بڑے دعوے میں اپنا ضرورت مند بنا دیتی ہے۔یعنی مرد جس بنیاد پر اپنی فوقیت کا دعویٰ کرتا تھا، عین اسی بنیاد پر مردوں کو، اپنے زمانے کے بہترین مردوں کو اپنا دست نگر بنا لینا ایک بہت بڑا کمال ہے؛ اس کمال کا معاشرتی اور نفسیاتی نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم معاشرہ مرد اور عورت کے اس تصادم سے محفوظ رہا جس میں دیگر مذہبی معاشرے مبتلا رہے ہیں۔ رابعہ بصریؒ جیسی خواتین کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے تہذیب کو وہ صنفی ہم آہنگی (gender harmony) عطا کر دی جس ہم آہنگی کو عمل میں لائے بغیر اور ایک قدر کے طور پر برپا کیے بغیر کوئی تہذیبِ انسانی تہذیب کے نام سے زیادہ دیر موجود نہیں رہ سکتی۔ ان کا ایک اور بہت بڑا تہذیبی کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس روایت کی پیدائش کا ایک مضبوط ذریعہ بنیں جہاں اللہ سے تعلق کی فضیلت میں کوئی صنفی تخصیص نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ ان کی ذات سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کا عاشق بننے کی دوڑ میں عورت کے پاؤں بندھے ہوئے نہیں ہیں۔

تیسرے کارنامے سے جڑا ہوا ایک کارنامہ اور بھی ہے۔ آپ نے چینیوں کا ین (Yin) اور یینگ (Yang) کا تصور تو پڑھا ہوگا۔ اس میں ایک اصول نسائی اور ایک مردانہ ہے۔ ایک آسمان ہے جو بارش برساتا ہے اور ایک زمین ہے جو اس بارش کو سمیٹ کر زرخیزی کا سبب بنا دیتی ہے۔ تو رابعہ بصریؒ نے تہذیب کے ین (Yin) اصول کو اپنی ذات میں واضح (manifest) کر کے دکھایا۔ ہماری پوری غیر پیغمبرانہ روایت میں یعنی دوسری صدی ہجری کے بعد سے جو ہماری تاریخ شروع ہوتی ہے، ایک عورت تہذیبی آئیڈیل بننے کے عمل میں اس درجے کی کامیابی حاصل نہیں کر سکی جیسی رابعہ بصریؒ نے کر کے دکھا دی ہے۔ انھوں نے اپنے نسائی روحانی جوہر (spiritual essence) کو پوری طرح کام میں لا کر دکھایا یعنی انھوں نے اللہ کے حضور کو جذب کرنے کے نسائی اصول کو پوری طرح عمل میں لا کر دکھایا۔ یہ ان کا چوتھا کارنامہ ہے۔

پانچواں کارنامہ، جس میں وہ دوسروں کے ساتھ مشترک ہیں، وہ یہ ہے کہ انھوں نے دنیا کو دو کوڑی کا بنا کے رکھ دیا۔ آدمی کے دل میں صرف ایک چیز کی حقارت کا ہونا ضروری ہے۔ ویسے تو آدمی کا دل صاف ہونا چاہیے اس میں کسی کے لیے حقارت نہیں ہونی چاہیے لیکن ایک حقارت کا ہونا ضروری ہے، اور وہ دنیا کی حقارت ہے۔ دنیا کی حقارت تمام نیکیوں، اچھائیوں اور برائیوں کی پہلی ضرورت ہے۔ دنیا کے شکنجے سے نکلنا انسان کی پرواز کی پہلی ضرورت ہے۔ انسان اُس وقت تک اُوپر نہیں اٹھ سکتا جب تک دنیا کی دلدل سے اپنا پاؤں نہ چھڑا لے۔ لیکن چونکہ یہ دلدل نہایت دلکش ہے یعنی اس میں کائنات کے بہترین رنگ استعمال کر کے اسے پر کشش بنا دیا گیا ہے، تو ان رنگوں کو کھرچ کر اس دلدل کا اصل چہرہ دکھا دینا یہ صرف مذہبی اور روحانی کارنامہ نہیں بلکہ یہ ایک نفسیاتی اور تہذیبی کارنامہ بھی ہے۔ مطلب یہ کہ آدمی بننے کے لیے اس دلدل سے پاؤں نکال لینے والی قوت بہر حال درکار رہے۔ چاہے وہ آدمی کافر ہو یا مومن ہو۔ آپ اچھے کافر بھی دنیا کی محبت کے ساتھ نہیں بن سکتے، بعینہٖ آپ اچھے مومن بھی دنیا کی محبت کے ساتھ نہیں بن سکتے ہیں۔ رابعہ بصریؒ نے دنیا کے لیے ذوق اور احساس کی سطح پر ایک شدید ناپسندیدگی پیدا کر دی، یعنی کہ رابعہ بصریؒ ایک ایسی شخصیت ہیں کہ جن کی بدولت دنیا میں کامیابی حاصل کر لینا شرمندگی کا باعث بن گیا۔

تصوف میں دو اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں؛ منشیوں اور ریسرچ اسکالرز والے تصوف میں نہیں بلکہ باعمل

صوفیہ کے تصوف میں۔ یہ اصطلاحات ہیں: تفرید اور تجرید۔ صوفیہ کا کہنا ہے کہ توحید پر ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ تفرید اور تجرید کی دونوں منزلیں طے کی جائیں۔ ان دونوں کے بغیر توحید کا کوئی مطلب نہیں۔ تجرید pure transcendence کو کہتے ہیں؛ اور تفرید کہتے ہیں absolute individuation کو۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ اللہ کی صفات ہیں، لیکن بندوں کے لیے یہ معیار ہے کہ آدمی اللہ کے ساتھ موجود ہونا سیکھ گیا تو وہ صاحبِ تفرید ہے؛ اگر آدمی اللہ کے حضور میں غائب رہنا سیکھ گیا تو وہ صاحبِ تجرید ہے۔ یعنی تجرید مجھے اللہ کے آگے فنا ہونا سکھاتی ہے، تفرید مجھے اللہ کی نسبت کے ساتھ موجود رہنے کی تعلیم دیتی ہے۔ اگر یہ دونوں نمونے عملی حالت میں اپنی کامل ترین صورت میں دیکھنے ہوں تو وہ رابعہ بصریؒ کی شخصیت میں صاف نظر آتے ہیں۔ ان کا 'میں' اپنی پوری شدت کے ساتھ برقرار ہے، خدا پر نثار ہوکر معدومیت کی لہر میں بلبلے کی طرح بہتے چلے جانا بھی ان کی شخصیت سے ظاہر ہے۔ مطلب یہ کہ وہ دریائے عشق میں بننے والے بلبلے کی سی حیثیت رکھتی ہیں اور اس دریا کی تہہ میں موجود موتی کا مرتبہ بھی انھی کو حاصل ہے۔ موتی جس کی حفاظت سمندر اپنی پوری قوتِ وجود سے کرتا ہے اور بلبلہ جسے سمندر اپنے اوپر فنا ہونا سکھاتا ہے۔ ابھی آگے ہم ان کی جو نظمیں دیکھیں گے وہاں بھی اس کی جھلک نظر آئے گی، ایک جگہ تو انھوں نے صاف الفاظ میں کہا بھی ہے:

تجھ پر فانی تجھ سے باقی

اوپر ہم نے ان کی چند نمایاں خصوصیات بیان کی ہیں۔ اب ہم ان کی دو نظمیں پیش کرتے ہیں۔ پہلی نظم کا عنوان ہے:

''وہی میری سب سے بڑی ضرورت''

میرے دل میں تیری آس
سب سے بڑا خزینہ
تیرا نام میری زبان پر
سب سے شیریں کلمہ
وہ ہیں میری محبوب تریں ساعتیں

جو تیرے ساتھ گذرتی ہیں

اس میں ہمارے لیے یہ سبق ہے کہ وہ سب ساعتیں ناگوار ہونی چاہییں جو خود ہمیں اپنے ساتھ گذارنی پڑتی ہیں۔

یا اللہ میں رہ نہیں سکتی اس دنیا میں
تجھے یاد کیے بغیر
کس طرح رہوں گی اس دنیا میں
تیرا چہرہ دیکھے بغیر
میں اجنبی ہوں تیرے ملک میں
اور اکیلی ہوں تیرے پجاریوں میں
بس یہی خلاصہ ہے میری شکایت کا

ذرا غور کیجیے کہ کیا اس سے بڑا درد اور الم سوچا جا سکتا ہے جو اس مصرعے میں آ گیا ہے۔ یہ اللہ کا ملک ہے، میرا یا آپ کا ملک نہیں ہے۔ 'میں' اجنبی ہوں تیرے ملک میں، ساری انسانیت سمٹ کر ایک انفرادی شخصیت بن جائے اور وہ وہم و گمان سے زیادہ پھیلی ہوئی کائنات کے مقابلے میں ایک بڑا کردار (major character) بن کر سامنے آ جائے، یہ وہ تصویر ہے۔ ایک ''شکوہ'' آپ نے پڑھا ہوگا، ایک شکوہ یہ ہے۔

حضرت رابعہؒ کے کچھ واقعات بڑے زبردست ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ ایک ہاتھ میں پانی کا لوٹا اور دوسرے ہاتھ میں مشعل لیے چلی جا رہی تھیں۔ کسی نے پوچھا کہ آپ ایک ہاتھ میں پانی اور ایک ہاتھ میں مشعل لے کر کیا کرنے جا رہی ہیں؟ کہنے لگیں کہ آج میں نے طے کر لیا ہے کہ اس لوٹے کے پانی سے جہنم کی آگ سرد کر دوں گی اور اس مشعل سے جنت کو آگ لگا دوں گی تا کہ لوگ بے لوث ہو کر اللہ کی عبادت کریں۔ یعنی جنت کی لالچ اور دوزخ کے ڈر سے اللہ کی عبادت نہ کریں بلکہ اللہ کو پانے کے لیے اس کی عبادت کریں۔ یہ ہماری روایت میں ایک بہت اہم تصور ہے۔ اس مضمون کو، غالبؔ تو چھوٹا ہے، اگر حافظؔ اور فردوسیؔ بھی کہتے تو رابعہ بصریؒ کے اس عمل سے بڑھ کر خوبصورتی نہ پیدا کر سکتے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے الفاظ میں اظہار اور معنویت کی اتنی صلاحیت نہیں جتنی ان کی

شخصیتیں کامل ہوتی ہیں۔

آپ باقاعدہ ایک دُعا کیا کرتی تھیں کہ ’’یااللہ! اگر میں دوزخ کے خوف سے آپ کی عبادت کرتی ہوں تو مجھے دوزخ میں جھونک دینا، یااللہ! اگر میں جنت کی طالب بن کر آپ کے آگے سجدہ کرتی ہوں تو مجھے جنت سے ہمیشہ محروم رکھنا۔‘‘

میرے بھائی یہ بہت بڑا خطرہ مول لینے کے مترادف ہے۔ یہ صرف شاعری اور قافیہ بندی نہیں ہے، یہ ان کی دُعائیں ہیں جو وہ اللہ پر یقین کے ساتھ کیا کرتی تھیں۔ جاوید نامہ میں اقبالؔ کا ایک مصرعہ ہے جو ان کے بہترین مصرعوں میں شامل ہوسکتا ہے:

بحرم و از من کم آشوبی خطاست

میں سمندر ہوں اور میرا طوفان نہ اُٹھانا غلط ہوگا۔ یعنی یہ کہ میں ایک سمندر ہوں اور میرا کام طوفان اٹھانا ہے اور اگر میں طوفان اٹھانے میں معطل رہ جاؤں گا تو میں کہاں کا سمندر رہوں گا۔ یہ اقبالؔ کا بہت خوبصورت مصرعہ ہے۔ یہ مصرعہ اقبالؔ کا تخیل ہے اور رابعہ بصریؒ کا حال ہے۔ یہ مصرعہ اقبال کہیں گے تو ان کے لیے تعلّی ہے اور رابعہ بصریؒ کہیں گی تو ان کا انکسار ہوگا۔ یہ شخصیت ہے رابعہ بصریؒ کی۔

ذرا دیکھیے یہ حکایت کیسی اچھی ہے کہ لوٹے کے پانی سے جہنم کی آگ کو بجھا دوں گی اور مشعل سے جنت کو آگ لگا دوں گی تاکہ لوگوں میں جو شرک فی المطلوب پیدا ہوگیا ہے اس کا سدباب ہو۔ تم لوگ شرک فی المعبود تو دیکھتے ہو شرک فی المطلوب اور شرک فی المحبوب بھی کبھی دیکھا ہے۔ ان کی ایک نظم ہے:

’’حقیقت‘‘

محبت میں کچھ نہیں رہتا
دل اور دل کے بیچ
کلام بچہ ہے درد کا
سچا بیان پھل ہے حقیقی ذوق کا

جس نے چکھ لیا وہی جانتا ہے
جو بس باتیں کرتا ہے وہ جھوٹا ہے
تم کیسے بتا سکتے ہو کسی چیز کی حقیقی صورت
وہ کون ہے جس کے آگے تم مٹ جاتے ہو
اور وہ کون ہے جس کا ہونا ہی تمھارا ہونا ہے
اور کون ہے جو ظاہر ہے
تمھارے سفر کی روشن نشانی کی طرح

یعنی اللہ ہی منزل، اللہ ہی راستہ اور اللہ ہی ہے راستے میں سمتوں کا نشان۔ یہ اس کا مفہوم ہے۔ اب یہاں فریدالدین عطار کی غزل کا قطعہ دیکھیے، فریدالدین عطار نے کمال کیا ہے اور ممکن ہے کہ بی بی رابعہ بصریؒ کا فیض ان کو پہنچا ہو کیونکہ بی بی رابعہ بصریؒ کا ان سے بڑا مداح ہماری تاریخ میں کوئی نہیں ہے۔ فریدالدین عطار کا فارسی قطعہ ہے:

دوش آمد و گفت ازانِ ماباش
از جملۂ خاصگانِ ماباش
پرّندہ ز آشیان مایی
جویندۂ آشیانِ ماباش

ترجمہ:

کل وہ محبوب آیا اور اُس نے کہا کہ میرا بن جا، میرے خاص دوستوں میں شامل ہو جا۔
تُو میرے ہی آشیانے سے اُڑا تھا اور اب میرے ہی آشیانے کو ڈھونڈنے والا بن۔

حضرت رابعہ بصریؒ نے بیاسی (۸۲) یا تراسی (۸۳) سال کی عمر میں وفات پائی۔ آپ نے عمر بھر شادی نہیں کی حالانکہ آپ سے شادی کی خواستگاری اُس گورنر بصرہ نے بھی کی جس نے چار ہزار آپ کے والد کی نذر کیے تھے۔ آپ نے اس کی شادی کی درخواست پر یہ جواب دیا کہ میرے پاس شادی کے لیے نہ حال ہے اور نہ وقت۔ ساری زندگی آپ کے پاس صرف تین چیزیں رہیں۔ ایک ٹوٹی ہوئی کھجور کی چٹائی، ٹوٹا ہوا مٹی کا کوزہ اور ایک اینٹ

جسے سرہانے کے طور پر استعمال کرتی تھیں۔ایک شخص نے قیمتی تحائف دیے تو اسے کہا کہ جو چیزیں میں اللہ سے نہیں مانگتی وہ لوگوں سے لوں گی؟ اس جملے کی کاٹ کو ذرا محسوس کیجیے۔آپ وہ شخصیت ہیں جن کا ایک فقرہ بھی اگر گوشِ دل سے آمادگی کے ساتھ سن لیا جائے ہماری زندگی کا کامل ترین انقلاب بن سکتا ہے۔یعنی کامل فرد بننے کے لیے اُن کا ایک جملہ بھی کافی ہے جیسے یہی جملہ کہ ''میں جو چیز اللہ سے نہیں مانگتی وہ تم سے مانگوں گی؟''

(احمد جاوید صاحب ملک کے معروف ادیب، شاعر اور فلسفی ہیں)

مہروز بن ایوب

اقبال اور نیٹشے

کلامِ اقبال کے بغور مطالعہ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اقبال کے یہاں نہ صرف فلسفۂ قدیم کے عناصر پائے جاتے ہیں بلکہ جدید فلسفے کے اثرات بھی واضح ہیں۔ ان خیالات کا تعلق معاشرت سے ہو یا معیشت سے، سیاست سے ہو یا اقتدار سے، تصّوف سے ہو یا دنیا و مافیہا سے، اقبال نے ان سب کو اپنے فکر و تخیل کے سانچے میں ڈھالا اور ایک یگانہ رنگ دے کر شاعری کا جامہ پہنا دیا۔ ان تمام رنگوں میں مغربی مفکرین کا رنگ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ ان مفکرین میں کانٹ، شوپن ہائر، ملٹن، برگساں، نیٹشے اور جیمز وارڈ جیسے بڑے ناموں کا شمار ہوتا ہے۔ اس بات میں کوئی ہیٹی نہیں کہ اقبال نے فکر کی تعمیر کے لیے مغربی خیالات و تحقیق سے استفادہ کیا۔ یعنی اقبال نے محض مغربی و مشرقی خیالات کو یکجا کر کے ہمارے سامنے پیش نہیں کیا بلکہ اسلامی روایات کو بنیاد بناتے ہوئے، مغرب کا جائزہ لیا ہے۔ جہاں بھی حق دیکھا، انھوں نے اپنا لیا اور جہاں باطل دیکھا، اُسے رد کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ:

مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم
ورائے شاعری چیزے دگر نیست

(*Hundred Years of Iqbal Studies*، ص۴۸۳)

رومؔی کے بعد، شاید جس شخصیت کا اثر فکرِ اقبال پر سب سے زیادہ حاوی رہا ہے، وہ نیٹشے ہی ہے۔ خود اقبال نے کئی مقامات پر نیٹشے کا ذکر اپنے کلام میں کیا ہے۔ پیامِ مشرق میں ہی اس کے نام کے زیرِ عنوان اس کا ذکر چار بار آیا ہے۔ اس حوالے سے ایک قطعہ یہ ہے:

گر نوا خواہی ز پیش او گریز
در نئے کلکش غریوِ تندر است

نیشتر اندر دِل مغرب فشرد
دستش از خونِ چلیپا احمر است

آں کہ بر طرح حرم بت خانہ ساخت
قلبِ او مومن دماغش کافر است
خویش را در نارِ آں نمرود سوز
زاں کہ بستانِ خلیل از آذر است

(اقبال اور مغربی مفکرین ،ص۱۰۰)

اس قطعے کے ساتھ انھوں نے کہا کہ:

نیٹشے نے مسیحی فلسفۂ اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے۔اس کا دماغ اس لیے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے مگر بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مذہبِ اسلام کے بہت قریب ہیں۔قلب اومومن ودماغش کافراست۔

(ایضاً)

نیٹشے کی ولادت اس عہد میں ہوئی جب یورپ معاشی اور سیاسی عروج پہ تھا۔ایشیا اور افریقہ کے استحصال سے دولت کا سیلاب یورپ میں آرہا تھا۔مگر اس سب کے ساتھ ساتھ، صنعتی انقلاب اپنی آغوش میں کئی ناہمواریاں بھی لایا جن سے زندگی کا توازن بگڑ گیا۔نیٹشے نے اپنی کتابوں میں متعدد مرتبہ اسی عدم توازن پر تبصرہ کیا ہے اور اسے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔کانٹ یا ہیگل کی طرح اس نے زندگی کے مسائل کو منطقی نگاہ سے نہیں دیکھا بلکہ مہاتما بُدھا کی طرح اُس توازن کی تلاش میں نکلا جو اسے حقیقت کے سامنے لے آئے۔یہ اس دور کی بات ہے جب شیلنگ اور ہیگل کے تصورات عام تھے، ڈارون کا نظریۂ ارتقا دنیا پر حاوی ہو چکا تھا، جرمنی یکجا ہو گیا تھا اور سائنسی ترقی نے ہر ذی شعور کو تابناک مستقبل کا اُمیدوار بنا رکھا تھا۔مگر اس سب کے باوجود نیٹشے نے اس تہذیب کو کھوکھلا قرار دیا اور انسان کی حقیقی کامیابی کی تلاش جاری رکھی۔یہی وجہ ہے کہ نیٹشے نہ صرف ایک ناقد تھا بلکہ ایک بت شکن اور اپنے دور کا ایک پیغمبر بھی

تھا۔اقبال نے نیٹشے کی یہ عجیب وغریب کیفیت اس طرح بیان کی:

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

(ایضاً،ص۱۰۱)

اقبال ''مجذوبِ فرنگی'' کی وضاحت کرتے ہیں:

جرمنی کا مشہور مجذوب فلسفی نیٹشے جو اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کرسکا اور اُس کے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستے پر ڈال دیا۔

(ایضاً،ص۱۰۱)

ایک اور مقام پر اقبال نے اسے 'مجذوب' اور 'حلاج' کہا ہے:

باز ایں حلاج بے دار و رسن
نوعِ دیگر گفتہ آں حرف کہن

......

حرف او بے باک و افکارش عظیم
غربیاں از تیغ گفتارش دو نیم

......

ھم نشین بر جذبۂ او پے نبرد
بندۂ مجذوب را مجنون شمرد

(*Iqbal and Post-Kantian Voluntarism*، ص۲۶۰)

اقبال کا خیال تھا کہ اگر نیٹشے کے پاس شیخ احمد سرہندی جیسا پیر ہوتا تو اسے راہِ حق دکھا دیتا۔اقبال کے الفاظ میں:

کاش بودے در زمان احمدے
تا رسیدے بر سرور سرمدے

(ایضاً،ص۲۶۲)

لہٰذا مندرجہ بالا اشعار یہ جاننے کے لیے مشعلِ راہ ہیں کہ نیٹشے کے کن خیالات کو اقبال نے قبول کیا اور کن تصورات کو رد کر دیا۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ نیٹشے کے قلبی رجحانات نے اقبال کو خوابِ کہن سے جھنجھوڑا اور ان کے فکر کو وہ قوت بخشی جس سے اقبال نے شکست خوردہ اور نادارامتِ مسلمہ کی تعمیرِ نو کا عزم کیا۔

''قوت کی چاہت'' نیٹشے کے فلسفے کا بنیادی اصول ہے۔ اُس کے نزدیک انسان کے تمام اعمال کا مقصود و منتہیٰ قوت کا حصول ہے۔ یہ وہ چاہ ہے جس سے زندگی کی تمام شاخیں پھیلتی ہیں۔ اس کے اپنے الفاظ میں:

> ایک ذی حیات سب سے بڑھ کر چاہتا ہے کہ قوت کا مظاہرہ کرے۔ زندگی کی چاہ خود ہی قوت کی چاہ ہے: خود کی حفاظت بھی دراصل ایک بلاواسطہ نتیجہ ہے اس چاہ کا۔

(بحوالہ بالِ جبریل کا عمیق مطالعہ: ریفرنس پیکج، جلد دوم، ص۴۶۹)

یہاں زندگی کی چاہ (will to live) اور قوت کی چاہ (will to power) کو یکجا قرار دیا ہے۔ اس حوالے سے شوپن ہائر کا تذکرہ لازم ہو جاتا ہے۔ روایت ہے کہ نیٹشے نے اپنی جوانی میں شوپن ہائر کی کتاب *The World as Will and Idea* پڑھی جس کا وہ مداح ہو گیا۔ اِس میں اس نے زمانۂ حاضر کے تاریک پہلوؤں پر بجا تنقید پائی۔ حال آنکہ چاہ کی ترجیح (primacy of will) شوپن ہائر کے فلسفے کی بنیاد ہے مگر بایں ہمہ اس نے اس کائنات کو ایک اندھی قوت پر کارفرما پایا اور اس زندگی کو بے مقصد قرار دیا اور اس دنیا سے نجات کے دو طریقے بتائے: ایک ترکِ دنیا یا رہبانیت کے ذریعے اور دوسرا اچھے اعمال سے۔ شوپن ہائر کے لیے یہ دنیا تاریک ہے، درد سے بھری ہوئی، غم سے لبریز۔ پس، جیسے مہاتما بدھ نے کیا تھا، وہی بہترین اصولِ زندگی ہے، یعنی دنیا سے نجات۔ مگر نیٹشے کب ایسے خیالات کا ساتھ دے سکتا تھا۔ نیٹشے کے لیے اثبات، نہ کہ نجات اصولِ حیات ہے۔ شوپن ہائر اور نیٹشے کے اسی امتیاز پر اقبال نے پیامِ مشرق میں ایک نظم کہی ہے جس کا نام ''شوپن ہار و نیٹشا'' ہے۔ کچھ اشعار شوپن ہائر کے متعلق یہ ہیں:

سوزِ فغانِ او بہ دلِ ہدہدے گرفت
با نوکِ خویش خار ز اندام او کشید
گفتش کہ سودِ خویش ز جیبِ زیاں بر آر
گل از شگافِ سینہ زرِ ناب آفرید

درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شدی
خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

(اقبال اور مغربی مفکرین،ص۹۹)

بعدازاں نیٹشے نے اپنی توجہ اپولونین (apollonian) اورڈایونزین (dionysion) کے تصورات کی جانب ملحوظ کی۔ ڈایونزین تصور میں زندگی کوخوش آمدید کیا جاتا ہے۔اس کے رنگوں اور پہاڑوں کا استقبال کیا جاتا ہے اور زندگی کے جمال سے لطف اٹھایا جاتا ہے۔نیٹشے کے لیے اس زبردست تہذیب کا خاتمہ سقراط اور افلاطون کے ہاتھوں ہوا کیونکہ انھوں نے منطق اور گفتگو کو شوق وجذبات پر ترجیح دی۔ نیٹشے کے الفاظ میں:

> سقراط کے وقت سے یونانی فلسفہ زوال کی نشانی ہے، جب غیر یونانی تصورات نے غلبہ حاصل کرلیا۔

(*Iqbal and Post-Kantian Voluntarism*،ص۲۶۵)

لہٰذا نیٹشے نے اس زوال سے لڑنے کے لیے ایک نیا نعرہ بلند کیا جس سے ایک نئی تہذیب کی ترتیب مقصود تھی۔ یہ نئی تہذیب روایتی اقتدار اور عیسائیت سے پاک ہوگی۔اس میں زندگی کے طوفان اور قوت کوفوقیت دی جائے گی نہ کہ مذہب، سائنس یا اقتدار کو۔ نیٹشے کے اپنے الفاظ میں:

> حق کا دارومدار احساسِ قوت کی نشوونما ہے۔

(بحوالہ بالِ جبریل کا عمیق مطالعہ: ریفرنس پیکج،جلد دوم،ص۴۷۰)

نیٹشے پوچھتا ہے وہ امتیازی خصوصیت کیا ہے جو طاقت ور کو کمزور سے الگ کرتی ہے؟ اس کا جواب دیتا ہے کہ قوت کی چاہ۔اس چاہ کی تسکین ہی سے زندگی میں قدر و قیمت پیدا ہوتی ہے۔نیٹشے اس امر پر فخر کرتا ہے کہ اس نے وہ حقیقت دریافت کرلی ہے جس سے وہ ''ہاں'' اور ''نہیں'' کا فیصلہ کرسکتا ہے۔یعنی:

> میں ہر اس چیز کو ''نہیں'' کہتا ہوں جو کمزور کرتی ہے۔

(*Iqbal and Post-Kantian Voluntarism*،ص۲۶۵)

اور

میں ''ہاں'' کہتا ہوں ہر اس شے کو جو قوت دے، جو مضبوط کرے اور جو احساسِ طاقت بیدار کرے۔

(ایضاً،ص۲۶۷)

اس قوت کی چاہ (will to power) ہی کی وجہ سے نیٹشے ڈارون اور سپنسر کی مخالفت کرتا ہے جنھوں نے غیر متحرک مناسبت پر زور دیا۔ زندگی تو جدت وندرت سے اپنے ماحول کو تبدیل کر دیتی ہے۔ محض مناسبت اختیار کرنا تنزلی کی نشانی ہے۔ ماحول کو تبدیل کرنے سے مراد صرف جسمانی قوت کی نشو ونما نہیں۔ سیاسی قوت یا دولت کا انبار بھی نیٹشے کے لیے قوت کا معیار نہیں۔ اصل قوت اپنی عقل، جذبات اور قدرت پر اختیار حاصل کرنا ہے۔ زرتشت (Zarathushtra) میں انسانوں کی اخلاقیات پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اگر چہ ہر قوم میں اخلاقیات کا معیار مختلف ہے مگر ان سب میں ایک قدر یکجا ہے، خود پر اختیار وارادہ حاصل کرنا۔ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے نیٹشے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ خواہشِ قوت صرف اعلیٰ ترین انسان میں ہی نہیں بلکہ ہر ذی حیات میں موجود ہے:

جہاں بھی زندگی ہے وہاں چاہ ہے؛ زندگی کی چاہ نہیں، بلکہ میں تمھیں سکھاتا ہوں: قوت کی چاہ۔

(ایضاً،ص۲۶۹)

اس واسطے سے نیٹشے کے نزدیک جنگ کی بہت قدر و قیمت ہے۔ وہ جنگوں کا درس دیتا ہے اور سکون و آرام طلبی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

تم امن سے محبت کرو تا کہ تمھیں یہ جنگوں کا راستہ دکھائے......

(بحوالہ بالِ جبریل کا عمیق مطالعہ: ریفرنس پیکج، جلد دوم،ص۴۷۰)

اس کے خیال میں جنگ اور بہادری نے خیرات وصدقات سے زیادہ عظیم کام کیے ہیں۔ ہمدردی نہیں، بلکہ بے باکی نے کئی جانیں بچائی ہیں۔ جو نیٹشے کی زبان ہے، اسی خیال کی صدا بلند کرتے ہوئے عقاب اور سانپ کی

علامتیں پیش کرتا ہے۔عقاب فخر کی علامت ہے اور سانپ دانشمندی کی۔

خود مختاری اور خود پر اختیار حاصل کرنے کے عمل کو اس نے sublimation کا نام دیا ہے۔اس نے Blond Beast اور Cesare Borgia کو بے اختیار حیوانی جبلتوں کا نمائندہ بنایا ہے۔اگر ان جبلتوں کی sublimation کر لی جائے تو اعلیٰ سطح پر پہنچا جا سکتا ہے۔تہذیب خود ہی دراصل اس مجموعی sublimation کا نام ہے جس سے انتشار کی قوتیں ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔طلبِ قوت کی دوسری صورت کو نیٹشے نے geist، spirit یا منطق کہا ہے۔جذبات اور جبلت کے ساتھ ساتھ، عقل بھی خواہشِ قوت کے ہاتھ میں ایک آلہ ہے۔منطق sui generis ہے؛ یہ (عقل) انسان کو خود پر اختیار حاصل کرنے میں مدد کرتی ہے۔یہ تمام جذبات کو ہم آہنگ کرتی ہے اور ان میں امن پیدا کر دیتی ہے۔ مختصراً؛ منطق طلبِ قوت کا اعلیٰ ترین اظہار ہے۔

جہاں تک قوت کے حصول کا تعلق ہے، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال نے نیٹشے کی سختی، صلابت اور پختگی کو اپنایا ہے، بلکہ یہاں تک کہ اس نظریے کو اپنے فکر اور اس کام میں بہت اہم جگہ عطا کی۔مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیے:

کہا پہاڑ کی ندی نے سنگ ریزے سے
فتادگی و سر افگندگی تری معراج
ترا یہ حال کہ پامال و دردمند ہے تو
مری یہ شان کہ دریا بھی ہے مرا محتاج!

(اقبال اور مغربی مفکرین، ص۱۰۴)

اقبال نے اس فلسفۂ قوت وطاقت کا نکھرا ہوا اظہار ''خراباتِ فرنگ'' میں بے مثل خوبصورتی ولطافت سے کیا ہے۔اس مقام پر اقبال اور نیٹشے کے راستے جدا جدا ہو جاتے ہیں۔چاہِ قوت یا خواہشِ اقتدار دونوں کے قریب عزیز ہے مگر اقبال کے لیے شمشیر کے ساتھ حکمت اور جمال کا ہونا بھی لاینفک ہے۔جمال وجلال کا یہ امتزاج خود ذاتِ حق میں پایا جاتا ہے۔جس کا ظہور کائنات میں ہر آن ہوتا ہے۔اقبال کا تصورِ قوت نرمی، عاجزی اور غمگساری سے لبریز ہے۔''مردِ مسلمان'' میں وہ کہتے ہیں:

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

(بحوالہ بالِ جبریل کا عمیق مطالعہ: ریفرنس پیکج، جلد دوم، ص ۱۷۱)

''مردِ مسلمان'' ہی کے ایک اور شعر میں وہ مومن کی چار خصوصیات بیان کرتے ہیں جو دراصل خدا تعالیٰ کی خصوصیات ہی میں سے ہیں۔ فرماتے ہیں:

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

(ایضاً)

اسی تصور کا اظہار ڈرامائی اور مکالمی انداز میں ''خراباتِ فرنگ'' میں کیا گیا ہے۔ انھی نظموں میں کلامِ اقبال اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ انھوں نے اس بے دین قوت و سیاست کے کھوکھلے پن کا پردہ اٹھاتے ہوئے کہا:

نیک و بد را بہ ترازوئے دگر سنجیدیم
چشمہ داشت ترازوئے نصاریٰ و یہود
خوب، زشت است اگر پنجۂ گیرات شکست
زشت، خوب است اگر تاب و توانِ تو فزود

......

تو اگر در نگری جز بہ ریا نیست حیات
ہر کہ اندر گروِ صدق و صفا بود نہ بود

یہی وجہ ہے کہ اقبال جنگ کو قوت و اقتدار حاصل کرنے کا ذریعہ قرار نہیں دیتے۔ اقبال کا تصور اسلامی جہاد کا ہے جس کا مقصد حق کے لیے لڑنا ہے اور باطل قوتوں کے خلاف جدوجہد کرنا ہے۔ اقبال نے ڈکنسن کی تنقید کا جواب دیتے ہوئے وضاحت کی کہ تصادم انسان کے ارتقا کے لیے ضروری ہے۔ اسی لیے جنگ یا جہاد کا مقصد اخلاقی ہے نہ کہ نیٹشے کی طرح صرف سیاسی۔

نیٹشے کی اخلاقیات محض چاہِ قوت سے ہی جنم لیتی ہے۔اس کا ایمان ہے کہ خیر وشر کی کوئی مستقل اقدار نہیں ہو سکتیں۔زرتشت کی زبان سے کہلواتا ہے کہ ایک قدر جو ایک قوم کے لیے خیر تھی، دوسری قوم کے لیے شر ہوتی تھی۔ ایک عمل جو نفرت وحقارت سے ایک جگہ دیکھا جاتا تھا، دوسری طرف اُسی عمل کے گیت گائے جاتے تھے۔لہٰذا وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ صرف خیر وہ ہے جس سے قوت وغلبہ حاصل ہو اس کے برعکس شر وہ ہے جس سے کمزوری و ناتوانی پیدا ہو۔قوت کا حصول کسی بھی ضابطۂ حیات سے ہو، فرق نہیں پڑتا۔نیٹشے کے لیے اقدار کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔اس کے اپنے الفاظ میں:

فلسفہ، مذہب اور اخلاقیات زوال کی علامتیں ہیں۔

(بحوالہ بالِ جبریل کا عمیق مطالعہ: ریفرنس پیکج، جلد دوم، ص۴۷۲)

نیٹشے کے خیال میں 'شر' وقت کے حصول کے لیے ضروری ہے۔ یہاں شر سے مراد وہ خصوصیات ہیں جنھیں معاشرہ عام طور پر 'شر' کہتا ہے۔اس کے نزدیک اگر 'شر' میں خیر نہ ہوتی تو یہ کب کا مٹ چکا ہوتا۔اِس میں خود غرضی، ہوسِ اقتدار اور عیاشی نُمایاں خوبیاں ہیں۔قبل ازیں ان خوبیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔مگر نیٹشے کے لیے یہ گوہر ہیں: جنس گوہر ہے آزاد اور معصوم کا؛ ہوسِ اقتدار خوبی ہے حاکموں کی۔اور خود غرضی بھی حاکموں ہی سے وابستہ ہے۔

ایسے ہی خیالات کی بنیاد پر نیٹشے نے ''اخلاقِ آقا'' اور ''اخلاقِ غلام'' کا تصور پیش کیا۔اس سے مراد یہ ہے کہ آقاؤں کی قدریں مختلف ہوتی ہیں اور غلاموں کی مختلف۔ بہادر، نڈر، بے باک لوگوں کے لیے اخلاقِ آقا اور اس کے برعکس ڈر، خوف، عاجزی اور جھوٹ اخلاقِ غلام کی تقدیر میں ہوتے ہیں۔یقیناً اسی بنیاد پر اس نے عیسائیت کو اخلاقِ غلام کے زمرے میں شامل کیا جو انسانی شعور سے زندگی کی چاہ کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔اس کے برعکس نیٹشے کا superman کھڑا ہے جو اخلاقِ آقا کا شخصی مظہر ہے۔اخلاقِ آقا کے تحت 'اچھا' انسان دوسروں میں خوف کے جذبات پیدا کرتا ہے جب کہ اخلاقِ غلام کے تحت یہ خوف بیدار کرنے والا انسان 'برا' ہوتا ہے۔اس کے متعلق وہ کہتا ہے:

غلامانہ سوچ و تدبیر کے مطابق ، اچھا انسان امن میں رہنے والا ہونا چاہیے: وہ تمیز دار ہو، آسانی سے دھوکا کھا جائے ، اور تھوڑا سا بے وقوف بھی ہو۔

(ایضاً، ص۴۷۴)

باالفاظِ دیگر اس کو اخلاقِ ہجوم بھی کہا جا سکتا ہے۔ مگر اس اندازِ غلامی میں بھی قوت کی چاہ مضمر ہے۔ غلام چاہتا ہے کہ اپنے آقاؤں کی طاقت کو قابو میں رکھے تا کہ اس کے نصیب میں بھی قوت آ جائے۔ علاوہ ازیں، ایک اور بنیادی فرق اخلاقِ آقا اور اخلاقِ غلام میں آزادی کی تمنّا ہے۔ خوشیوں کی تمنّا بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ یہ غلاموں کی تدبیر کی ماحصل ہے۔ جب کہ حاکموں کے لیے قربانی اور جذبہ مقدس ہے۔ ہارلڈ ٹائٹس (Harold Titus) اس تصور کو نہایت جامعیت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نیٹشے کے مطابق، ترقی کا راز انسانوں کی اعلیٰ ترین نسل تیار کرنے میں ہے نہ کہ عام انسان کی خوشحالی میں۔ Superman کو عوام کی سطح سے بڑھ کر اپنا مقام حاصل کرنا پڑے گا نہ کہ ان کی سطح پر گر کے۔ نچلے درجے کے انسانوں کا سہارا لے کر ہی اعلیٰ ترین نسل وجود میں آئے گا۔ یہ نسل ہی خیر و شر کا فیصلہ کرے گی اور ہر قسم کی اخلاقیات سے ماورا ہوگی۔

اقبال نیٹشے کی وفات کے پانچ سال بعد یورپ گئے اور اس کے افکار کا طوفان اپنے چار سو پایا۔ اقبال خود اس دور میں پیدا ہوئے جب امتِ مسلمہ شدید انحطاط اور زبوں حالی کا شکار تھی۔ ان کے سامنے یہ سوال تھا کہ اتنی عظیم تہذیب اس حالتِ زار سے کیوں کر دوچار ہے۔ ''انسان'' اور ''بزمِ قدرت'' میں وہ پوچھتے ہیں:

نور سے دور ہوں ظلمت میں گرفتار ہوں میں
یوں سیہ روز، سیہ بخت، سیہ کار ہوں میں

(*Iqbal and Post-Kantian Voluntarism*، ص۲۸۷)

نیٹشے کے تصورِ قوت اور تصورِ اخلاق نے اقبال کے قلب میں انقلاب برپا کر دیا۔ انھوں نے وہ مے پالی جس کی قلت سے پوری امت زوال میں تھی۔ اقبال کے نزدیک، اخلاقِ غلام کا مسلمانوں میں عام ہونا ان کے زوال کی بہت بڑی وجہ ہے۔ اس تصور سے انھوں نے اتفاق کیا کہ جب غلامانہ سوچ قوموں میں راسخ ہو جاتی ہے تو ان کو خیر

سے خوف آتا ہے اور وہ آرام طلبی اور بے بسی پر خوش وخرم رہتے ہیں۔ اس فکر کا اظہار انھوں نے اسرار خودی میں کیا جب کہ حافظؔ جیسے عظیم شاعر کو اخلاقِ غلام کا علمبر دار قرار دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حافظؔ تو صرف ایک نمائندہ ہے اس غلامانہ سوچ کا جو کثرت سے اردو اور فارسی دیوانوں میں عام ہو چکی تھی۔ ان کا اسرار تھا کہ ہمارے ادب اور فن کو اس غلامانہ ذہنیت سے نجات کی ضرورت ہے۔ ایک جگہ کہا:

ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دلآویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز

(ایضاً، ص ۳۲۵)

قرآن پاک اور روایات میں ہمیں اس غلامانہ ذہنیت کے خلاف شدید مزاحمت ملتی ہے۔ ایسے اخلاق کی گنجائش اسلام میں نہیں جو دنیا کو قابلِ نفرت وملامت سمجھے۔ اقبال کی نظر میں یہ دنیا بھی بالحق بنائی گئی ہے اور اتنی ہی حقیقی ہے جتنی اگلی دنیا ہوگی۔ نیٹشے کی غلامانہ ذہنیت پر تنقید کو اقبال نے بہت سراہا۔ یہ تنقید روحِ اسلام کے عین مطابق تھی۔ اقبال نے کہا:

آں کہ بر طرح حرم بت خانہ ساخت
قلب او مومن دماغش کافر است

(ایضاً، ص ۳۱۴)

غلامانہ ذہنیت اور فقرِ مسلمان میں واضح تفریق کرتے ہوئے اقبال نے مسلمانوں کے زوال کا سبب دوٹوک الفاظ میں واضح کر دیا:

فقرِ کافر خلوت دشت و در است
فقرِ مومن لرزۂ بحر و بر است
فقر را تا ذوق عریانی نماند
آں جلال اندر مسلمانی نماند

(ایضاً، ص ۳۲۰)

نیٹشے کی پیروی کرتے ہوئے اقبال نے اس تصورِ اخلاقِ غلام کی بہترین ترجمانی دو نظموں میں کی ہے۔ ان نظموں کا کمال یہ ہے کہ قاری پڑھنے کے بعد ان کا اثر مسلسل محسوس کرتا رہتا ہے اور ایک کہانی کی صورت میں ذہن میں بٹھا لیتا ہے۔ ''شیروں اور بھیڑوں'' کے قصے میں شیروں کا گروہ موٹی بکریوں پر شکار کرنے لگ جاتا ہے۔ بھیڑوں نے سوچا کہ اس کا حل یہی ہے کہ شیروں کو بھیڑوں جیسا بنا دیا جائے۔ ایک بزرگ بھیڑ نے شیروں کو درس دیا کہ جو بھی طاقت وقوت رکھتا ہے، غمگین ہے۔ ترکِ خودی میں ہی اصلِ حیات ہے۔ بہشت صرف کمزوروں اور ناداروں کے لیے ہے۔ اسی لیے اس دنیا سے خود کو دور کر لو اور کنارہ کشی اختیار کر لو۔ ان تھکے ہوئے شیروں کو یہ بات بہت پسند آئی۔ وہ سکون طلبی اور تن آسانی پر آمادہ ہو گئے۔ بتدریج ان میں سے قوت کی توانائی خارج ہونا شروع ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ:

زور تن کاہید و خوف جاں فزود
خوف جاں سرمایۂ ہمت ربود

......

صد مرض پیدا شد از بے ہمتی
کوتہ دستی، بے دلی، دوں فطرتی

(ایضاً، ص۳۲۳)

اس کہانی میں مسلمانوں کو شیر اور بھیڑوں کو رہبانیت سمجھ لیا جائے تو مسلمانوں کی تاریخِ معراج و زوال ہمارے سامنے آ جائے گی۔ یہ تو تھی اخلاقِ غلام کی کہانی۔ اخلاقِ آقا کا بے نظیر اظہار ہمیں اقبال کی ایک اور نظم میں ملتا ہے جس میں ایک پیاسے پرندے کی کہانی ہے۔ اسی تصور کے اوپر ایک اور نظم ہے جو کہ الماس اور کوئلے کے مابین مکالمہ ہے۔ پہلی نظم میں پیاسا پرندہ گوہر کو پانی یا شبنم کا قطرہ سمجھ کر پینے کی کوشش کرتا ہے مگر گوہر کی سختی اسے ایسا کرنے نہیں دیتی۔ بعد ازاں وہ پیاسا پرندہ شبنم کا قطرہ دیکھتا ہے اور اسے پی جاتا ہے۔ آخر میں وہ سوال کرتا ہے جس سے شبنم اور گوہر کا فرق نکھر کر سامنے آ جاتا ہے:

اے کہ می خواہی ز دشمن جاں بری
ازِ تو پرسم قطرہ ای یا گوہری؟

(ایضاً، ص۳۳۴)

اس سوال کا جواب ہی انسان کی قدر و قیمت اور اس کی حیثیت متعین کر دے گا۔ اگر تم شبنم کا ایک قطرہ ہو تو غلام کی طرح اپنی انفرادیت، اپنی شخصیت اور اپنے جوہر سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ لیکن اگر تم گوہر جیسے بن جاؤ گے تو دشمن کی تمام تر کوششیں ناکام ہو جائیں گی اور تمھاری خودی برقرار رہے گی۔

دوسری کہانی الماس اور کوئلے کے درمیان مکالمہ ہے۔ دونوں کی ماہیت کاربن (carbon) ہے۔ مگر خودی کی ترقی میں زمین و آسمان کی سی تفریق ہے۔ ایک کے مقدر میں ہے کہ وہ جل کر راکھ ہو جائے جب کہ دوسرے کے مقدر میں ہے کہ وہ شاہوں اور امیروں کے تاجوں کی زینت بنے۔ بقول الماس، یہ سختی اور پختگی اس ماحول کا مسلسل سامنا کرنے پر پیدا ہوئی جب کہ کوئلے کی نرمی اور تن آسانی نے اسے خام اور بے ذوق بنا دیا۔ اقبال اپنے قاری پر زور دیتے ہیں کہ:

فارغ از خوف و غم و وسواس باش
پختہ مثل سنگ شو الماس باش
می شود از وے دو عالم مستنیر
ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر

......

در صلابت آبروے زندگی است
ناتوانی، ناکسی ناپختگی است

(ایضاً، ص ۳۳۴)

یہاں تک تو اقبال اور نیٹشے ہم خیال ہیں کہ دونوں کی فکر میں چاہِ قوت لاینفک ہے اور اس سے بڑھ کر، اخلاقِ آقا اس چاہِ قوت کا عملی اظہار ہے۔ لہٰذا صرف زندگی کو گذارنا ہی نہیں بلکہ خودی کا اثبات اصل مقصود ہے۔ مگر یہاں سے آگے اقبال نیٹشے کا ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ نیٹشے کی طرح ان کے نزدیک خیر و شر کی بنیاد فقط قوت کا حصول نہیں۔ اقبال کی فکر میں خودی اور صرف خودی ہی خیر و شر کو پرکھنے کا معیار ہے۔ جو عناصر خودی میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں، ''خیر'' ہیں۔ جو عناصر خودی میں انتشار و انحطاط پیدا کرتے ہیں، ''شر'' ہیں۔ اقبال کے خیال میں ایک کامل خودی،

جمال کو اپنے اندر سموئے ہوتی ہے۔اس میں وہ اندھی قوت نہیں ہوتی جیسا کہ نیٹشے نے پیش کیا ہے۔علاوہ ازیں اقبال نے خودی کے ارتقا کو نسلی بنیادوں پر نہیں پرکھا۔انسان غلام بھی اپنے اعمال سے بنتا ہے اور آقا بھی اپنے ہی اعمال سے بنتا ہے۔اس امر کی تفصیلی وضاحت آنے والے اوراق میں ملے گی جہاں نیٹشے کے سپر مین اور اقبال کے مردِ مومن کا تجزیہ کیا جائے گا۔

گذشتہ اوراق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، یہ صاف ظاہر ہے کہ نیٹشے کی تمام تگ ودو، اس کی تمام فکر اور اس کے خونِ جگر کا منتہیٰ سپر مین کی تخلیق ہے۔وہ بہترین حاکم ہوگا جس نے اپنی قدرت، اپنی جبلت اور اپنے رجحانات کو منظم کر لیا ہوگا۔ یہ انسان کے بعد آنے والی کوئی نسل نہیں ہوگی بلکہ نوعِ انسان میں سے ہی سپر مین کی آمد ہوگی۔اس حوالے سے وہ لکھتا ہے:

...... جہاں ایک اعلیٰ سطح کا انسان موجود ہے: جس کا تعلق انسانیت کے ساتھ ایک سپر مین (Ubermensch) کا ہے۔

(ایضاً، ص ۲۸۱)

Ecce Homo میں نیٹشے کا سپر مین ڈارونزم اور کارلائل کی ہیرو کی پرستش سے صاف صاف امتیاز رکھتا ہے۔ ڈارون کی طرح نیٹشے یہ نہیں مانتا کہ انسان کی قسمت میں حیوان کی طرح زندگی بسر کرنا لکھا ہے۔گو کہ وہ انسان کو حیوان سے زیادہ نہیں تسلیم کرتا مگر اس امر پر زور دیتا ہے کہ اس حیوانی سطح سے بڑھنا اس کی زندگی کا مقصد ہے۔وہ کہتا ہے کہ انسان کے اندر حیوان بھی ہے اور خالق بھی۔کارلائل سے اختلاف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سپر مین اپنے اندر ایک قدر رکھتا ہے۔ ہر انسان کی تمنا ہوتی ہے کہ اس جیسا ہو سکے۔نیٹشے نے نپولین کو سپر مین کے بہت قریب پایا۔کیونکہ نپولین محدود وطنیت سے آگے جا نکلا اور ایک متحدہ یورپ کا خواب دیکھنے لگا۔سیزر (Caesar) ایک اور مثال ہے سپر مین کی۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جو شوق سے لبریز ہے، مگر خود پر اختیار رکھتا ہے۔خود کو سمیٹنے والا، خود کو بنانے والا اور خود کو حاکم کہنے والا۔جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے، سپر مین میں تین 'شر' ہونا ضروری ہیں۔جنس، ہوسِ اقتدار اور خود غرضی۔نیٹشے کے تصورِ چاہِ قوت کا مظہر سپر مین ہے۔اس پر طاقت کا نشہ طاری ہوتا ہے۔وہ اعلیٰ ترین نسل کی خاطر کئی عام جانوں کو قربان

کرنے کے قابل ہوتا ہے کیونکہ وہ حاکم ہے جو اپنی ذمہ داریاں جانتا ہے۔

سپر مین کی دوسری خصوصیت رحم سے نفرت ہے۔ وہ دکھ اور درد کا علم بردار ہے۔ سختی اس کا شیوہ ہے۔ دکھ و درد کے بغیر سپر مین کا وجود ممکن نہیں۔ رحم کھانا زندگی سے منحرف ہونے کے مترادف ہے۔ رحم زندگی کی توانائیوں کے خلاف اور فرسودہ ہے۔ انسان جب رحم کھاتا ہے تو قوت کھو دیتا ہے۔ وہ طنزیہ انداز میں کہتا ہے:

> تم خواہش رکھتے ہو کہ دکھ مٹ جائے اور ہم؟ ہم چاہتے ہیں کہ پہلے سے کہیں زیادہ اور کہیں بدتر ہو یہ دکھ اور درد۔

(ایضاً، ص ۲۸۵)

نیٹشے کا سپر مین نسلی امتیاز سے اعلیٰ ترین ہوگا۔ نچلی سطح کا انسان سپر مین نہیں ہو سکتا۔ یہ معاشرے کے اس حصے سے ہوگا جس کا تعلق حاکموں سے ہے۔ اس فوق البشر کا جواز دیتے ہوتے وہ ان کی نسلی خوبیاں بیان کرتا ہے:

> (سپر مین) کا تعلق حاکموں کی نسل سے ہوگا یا جو نسلی طور پر قبضہ کرتے آئے ہیں۔ حاکم اکثر، اپنی قبضہ کرنے والوں کی ہی نسل سے نکلے ہیں۔

(بحوالہ بالِ جبریل کا عمیق مطالعہ: ریفرنس پیکج، جلد دوم، ص ۴۸۲)

اس خوبی کے تحت وہ (سپر مین) عام انسان سے بالاتر ہے۔ وہ اپنی اقدار خود متعین کرتا ہے اور باقی اس کی پیروی کرتے ہیں۔ عام انسان، عورت یا ریاست کی اس کے آگے کوئی حیثیت نہیں۔ نیٹشے کے مطابق عام انسان کے احترام کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں۔ یہ محض ''مجموعہ'' یا ''لاشیں'' ہیں۔ وہ زرتشت سے کہلواتا ہے:

> تخلیق کے ساتھی، نتائج کے ساتھی، خوشیوں کے ساتھی زرتشت ڈھونڈتا ہے۔ اس کا کیا لینا دینا ہے ہجوم سے، ہجوم کو پالنے والوں سے اور ان لاشوں سے۔

(ایضاً، ص ۴۸۵)

برٹرنڈ رسل (Bertrand Russell) نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے نیٹشے کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ وہ انسان کی خوشحالی کا خیر کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں سمجھتا ہے۔ خیر اور شر کا معیار صرف اعلیٰ ترین نسل کو ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

ایک عام انسان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوتا ہے نیٹشے کو اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ یہیں سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ نیٹشے کی نگاہ میں عورت کا مقام ایک عام آدمی سے بھی بدتر ہے۔ وہ کسی بھی صورت سپر مین نہیں ہو سکتی۔ وہ عورت کو اس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا کہ اس کا کام بچے پیدا کرنا ہے۔ وہ حقارت انگیز الفاظ میں کہتا ہے:

مردوں کو جنگ کے لیے تیار کیا جائے گا اور عورتوں کو سپاہی پیدا کرنے کے لیے۔ اس کے علاوہ سب بکواس ہے!

(ایضاً، ص۴۷۶)

نیٹشے کا سپر مین ابدی زندگی جیے گا۔ اسے موت ضرور آئے گی۔ مگر وہ پھر اسی دنیا میں زندہ ہو جائے گا۔ یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے چلتا رہے گا۔ اس مقام پر نیٹشے کے اس تصور کی مزید وضاحت ضروری ہے۔ نیٹشے کے نزدیک انسان میں کوئی روح نہیں ہوتی۔ موت کے بعد بھی روح نہیں بچتی۔ نیٹشے یہ سوال اٹھاتا ہے کہ کیا تم (انسان) وقت پر ایک مسلسل بوجھ بننا چاہتے ہو؟ بہر حال نیٹشے پھر بھی ہمیشگی کا تصور پیش کرتا ہے۔ مگر اس کا یہ تصور خالصتاً مادی ہے۔ اس سے مراد یہ ہوا کہ کوئی بھی انسان موت کے بعد فنا نہیں ہوتا۔ صرف انسان ہی نہیں، بلکہ ہر شے کا کچھ عرصے بعد دوبارہ وجود میں آنا لا ینفک ہے۔ اس کا یہ تصور صرف سائنسی مفروضات پر مبنی تھا جس کے مطابق وقت ایک کبھی نہ ختم ہونے والا دھارا ہے۔ اس کے خیال میں توانائی ایک مقدار میں منجمد ہے، اسی لیے، توانائی میں کبھی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ اس کے اپنے الفاظ میں:

میں واپس لوٹتا ہوں ہمیشہ اسی، بالکل اسی زندگی میں، ہر چھوٹے بڑے خصائص میں۔ سکھانے کے لیے کہ ہر شے نے واپس لوٹتے رہنا ہے۔

(ایضاً، ص۴۶۶)

فرینک مگل نے اس تصور کا اظہار نیٹشے کے اپنے مشہور الفاظ میں کیا ہے:

سب کچھ چلا جاتا ہے، سب کچھ واپس آتا ہے، یہ ہستی کا پہیہ یوں گردش کرتا رہتا ہے۔

(ایضاً، ص۴۶۶)

یہ تو تھا نیٹشے کے سپر مین کا تصور۔ جیسا کہ پہلے دیکھا گیا ہے، جہاں تک قوت کے حصول کا تعلق ہے، اقبال نیٹشے کے ساتھ ہے اور اس کے قدم پر چلتا ہے۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھیں تو تخلیقِ آرزو اور قوتِ ارادی بھی اقبال کی نظر میں یگانہ گوہر ہیں۔ ان مقامات پر صاف ظاہر ہے کہ مردِ مومن سپر مین کی بھی کئی خوبیاں اپنے اندر سمائے ہوئے ہے جو اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہیں۔ اقبال کی فکری دنیا میں اس کا اثر دیکھیں:

بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگر شیشہ و پیانہ و مینا کر دیں

(*Iqbal and Post-Kantian Voluntarism*، ص ۲۸۹)

اسلام اور قرآنِ پاک کی تعلیمات کا تمہیدی جائزہ لیا جائے تو اقبال کے مردِ مومن اور نیٹشے کے سپر مین کو بہت بہتر سمجھا جا سکتا ہے۔ اسلام اس امر پر بار بار زور دیتا ہے کہ انسان کے دل کی دنیا اور یہ خارجی جہان، دو متضاد جہان نہیں۔ ان کی حقیقت ایک ہی ہے۔ انسان کی روحانی زندگی ارتقا نہیں پا سکتی اگر وہ مادی زندگی کو مکمل طور پر رد کر دے۔ یعنی روح یا نفس کی نشو و نما کے لیے اس دنیا سے تعلق ضروری ہے۔ اسی طرح متعدد مقامات پر قرآنِ حکیم میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ یہ کائنات خدا کی تخلیقی قوتوں کا مظہر ہے۔ اس کی صفات کا مادی اظہار اس جہان کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہ اس کی پہچان، اس کے ادراک اور اس کے عرفان کا ایک طریقہ ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ بات بھی صاف صاف قرآنِ پاک میں بیان کر دی گئی ہے کہ یہ جہان انسان کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس کا ماحول، اس کا مقصد انسان کو اس کی تقدیر کا احساس دلاتا ہے۔ لہٰذا اسلام نے رہبانیت سے راستہ علاحدہ کر کے، روح کی دنیا اور مادے کی دنیا میں ربط پیدا کیا ہے۔ یہ امر اتنا بنیادی ہے کہ اس کو سمجھے بغیر صرف مردِ مومن کو ہی نہیں، بلکہ اسلام کی کسی تعلیم کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ اس کی مزید وضاحت یہ بھی ہے کہ اسلام میں دین و دنیا ایک ہی ہیں۔ تمام زندگی کے گوشوں میں قانونِ الٰہی کارفرما ہوتا ہے خواہ وہ سیاست ہو، معاشرت ہو یا معیشت۔ اسلام ذاتی اور معاشرتی زندگی میں ہرگز تفریق نہیں کرتا۔ یہاں دونوں ہی مقدس ہیں۔ دونوں پر احکامِ خدا یکساں نافذ ہوتے ہیں۔ اقبال ان خیالات کو دو مصرعوں میں سمیٹتا ہے:

ارتباطِ حرف و معنی! اختلاطِ جان و تن
جس طرح اخگر قباپوش اپنی خاکستر سے ہے

(ایضاً،ص۲۹۶)

اقبال کا مردِ مسلمان اس حقیقت کو مکمل طور پر سمجھتا ہے۔ ہر لحظہ اس مادی دنیا میں وہ ذاتِ حق کی تجلی کا منتظر ہوتا ہے۔ یوں کہیے کہ:

نائبِ حق در جہاں آدم شود
بر عناصر حکم او محکم شود

(ایضاً،ص۲۹۷)

مردِ مومن کی تخلیق کیسے عمل میں آتی ہے؟ کیا یہ نسلی طور پر سپر مین کی طرح منتخب ہوتا ہے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ اقبال نے خودی کے ارتقا کی انتہا کا مقام ہی مردِ مومن کا مقام ٹھہرایا ہے۔ اقبال اس نشو ونما کے تین ادوار پیش کرتا ہے جیسا کہ نیٹشے بھی تین ہی ادوار کا ذکر کرتا ہے۔ پہلے دور کی نمائندگی 'اونٹ' سے کی گئی ہے۔ یہ اونٹ اپنے اوپر جتنا بوجھ اٹھا سکتا ہے، اٹھاتا ہے۔ وہ اپنے اس اظہارِ قوت پر خوشی محسوس کرتا ہے۔ وہ کچھ حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی مشکلات اور دکھوں کا سامنا کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو پابند کرتا ہے۔ اس دور میں اس کا مزاج عاجزی اور اطاعت کا ہوتا ہے۔ خودی کے دوسرے دور کی نمائندگی 'شیر' سے ہوتی ہے۔ اس دور میں خودی آزادی کی طلب گار ہوتی ہے۔ عقائد سے آزادی، قانون سے آزادی اور روایات سے آزادی۔ اب انسان اطاعت کی بجائے اپنی خودی کا اثبات چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام اقدار پہلے سے بن چکی ہیں اور میں ان تمام اقدار کا نمائندہ ہوں۔ وہ اس دور میں بالکل آزاد ہے۔ مگر یہ دور منفی ہے، مثبت نہیں۔ یہ وہ درمیانی دور ہے جہاں انسان 'نہیں' کہتا جا رہا ہے۔ خودی اس عبوری دور میں 'لا' سے 'الا' کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اگر خودی اس عبوری دور کو پار کر لے تو تیسرے دور میں آ جاتی ہے جو آخری دور ہوتا ہے۔ اس کی نمائندگی 'ایک' سے کی گئی ہے جو امید اور تخلیق کے پیغام سے لبریز ہے۔ وہ زندگی کو 'ہاں' کہتا ہے۔ پہلے دور میں دونوں، اقبال اور نیٹشے اونٹ کو نمائندہ بناتے ہیں۔ نیٹشے کے سپر مین کے لیے وہ بوجھ

اخلاقیات کا ہوتا ہے جو مذہب عائد کرتا ہے مگر اس کے برعکس اقبال کے مطابق یہ بوجھ کسی بھی دور میں اتارا نہیں جا سکتا۔فرق آخری دور میں یہ ہے کہ یہ بوجھ، بوجھ نہیں رہتا، مردِ مومن کی اپنی مرضی بن جاتی ہے۔اس امر کو اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے:

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

(ایضاً،ص۳۴۲)

نیٹشے بھی خود کی پابندی کا قائل ہے۔مگر مردِ مومن اور سپر مین میں فرق یہ ہے کہ مومن احکامِ الٰہی کا پابند ہوتا ہے جب کہ سپر مین اپنی خود عائد کردہ پابندیوں کا۔نیٹشے چونکہ منکرِ خدا تھا اس لیے زندگی کو کوئی روحانی بنیاد نہ دے سکا؛ اور یہی وجہ ہے کہ نیٹشے خودی کو مکمل کرنے میں وہ تنظیم اور ہم آہنگی عطا نہ کر سکا جو اقبال کے تصورِ خودی نے کیا۔اسی حوالے سے اقبال کا تصورِ فقر بھی سامنے آتا ہے۔اقبال کے لیے فقر سے مراد ناتوانی اور ناداری نہیں۔فقر دراصل مردِ مومن کا ہی دوسرا نام ہے۔بالِ جبریل میں وہ رومیؔ سے پوچھتا ہے:

کاروبار خسروی یا راہبی
کیا ہے آخر غایتِ دینِ نبی؟

اس کے جواب میں رومی حقیقت بیان کرتے ہیں:

مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ
مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ

اس مقام پر ''جہاد'' کا تصور بھی قابلِ ذکر ہے۔نیٹشے کے مطابق سپر مین ہوسِ اقتدار میں جنگیں کرتا ہے۔اس کی تمنّا ہوتی ہے کہ وہ دوسروں پر غالب آ جائے۔مگر اقبال کے لیے ایسا ہرگز نہیں۔مردِ مسلمان طاقت و اقتدار کا حصول صرف اور صرف حق کے لیے کرتا ہے۔اسلام میں اقتدار خدا کا ہوتا ہے نہ کہ کسی سپر مین کا۔نیٹشے تو کہتا ہے کہ سپر مین نے خدا کی جگہ لے لی ہے۔اس کا بہت معروف قول ہے:

سارے خدا مر گئے ہیں۔اب صرف سپر مین زندہ ہے۔

(بحوالہ بالِ جبریل کا عمیق مطالعہ: ریفرنس پیکج، جلد دوم، ص۵۰۳)

مگر مردِ مومن کوئی خدا نہیں۔ لہٰذا، مختصر الفاظ میں، مردِ مومن فقر کے اس مقام پر ہے جہاں وہ خود تقدیرِ یزداں بن جاتا ہے۔ اور تقدیرِ یزداں یہ ہے کہ ہر مسلمان باطل کے خلاف کھڑا ہو اور یہ مقدس فریضہ ادا کرنے والے کو ''مجاہد'' کہا جائے گا۔ نماز و روزہ و حج کا مقصد ہی مومن کو اس جہاد کے لیے تیار کرنا ہے۔ مردِ مسلمان کی تگ و دو اسی زمان و مکان تک محدود نہیں۔ جہانِ فردا کی تمنا اور اپنے رب سے عشق مردِ مومن کو عمل پر آمادہ کرتے ہیں۔ نیٹشے کا سپرمین ایسے متاعِ یقین و ایمان سے خالی ہے۔ اس خلش پر اقبال لکھتے ہیں کہ:

> سپرمین تو لاتعداد مرتبہ پیدا ہو چکا ہے۔ اس نے تو پیدا ہونا ہی ہے۔ یہ کیسے عشق یا شوق کا باعث بن سکتا ہے؟ ہم صرف وہ چاہ سکتے ہیں جو بالکل نیا ہو اور نیا ہونے کا تصور نیٹشے کے فلسفے میں ممکن نہیں۔ یہ تو اُس قسمت سے بھی بدتر ہے جو ہمارے ہاں ہے۔ ایسا عقیدہ (ہر شے کے بار بار ظہور پذیر ہونے کا) صرف اور صرف خودی کے انحطاط کا باعث بن سکتا ہے۔

(ایضاً، ص ۴۸۴)

جیسے کہ نیٹشے نے نپولین اور سیزر کو سپرمین کی مثال بتایا ہے، اقبال کے لیے مردِ مومن اور خودی کا بہترین مظہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

مصطفیٰ داد از رضائے او خبر
نیست در احکام دیں چیزے دگر

(*Iqbal and Post-Kantian Voluntarism*، ص ۳۴۵)

'الا' ہی مردِ مومن کی خصوصیت ہے جو اسے سپرمین سے میلوں دور کھڑا کر دیتی ہے۔ حیاتِ جاوید کی تمنّا، اسے حاصل کرنا، مردِ مومن میں 'الا' کا وہ یقین پیدا کرتا ہے جس کا کوئی مقابل نہیں۔ مسلمانی حاصل کی جاتی ہے؛ یہ کسی کی وراثت نہیں۔ اقبال نے کہا ہے کہ اسلام نے بہت عام لوگوں کو مردِ مومن کے درجے پر پہنچایا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ کامل خودی کے تصور سے پورا قرآن پاک لبریز ہے۔ یقیناً اقبال نے نیٹشے سے توانائی لی ہے مگر اس تصور کی سمت رومی

اور قرآن پاک سے معین کی۔

نیٹشے اور اقبال میں مخالفت کے لحاظ سے ایک اور عنصر مشترک ہے۔نیشنلزم (جغرافیائی وطنیت) اقبال اور نیٹشے دونوں کے نزدیک باطل نظریہ ہے۔یورپ میں مارٹن لوتھر کے انقلاب کے بعد کلیسا کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اس معاشرتی خلا کو یورپ نے وطنیت سے پُر کیا۔ان محدود وفاداروں نے یورپ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور ان کو انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے محروم کر دیا۔اقبال افسوس کرتا ہے:

آں چناں قطع اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند

(ایضاً،ص۳۰۰)

نیٹشے نے بھی اس معاملے کو درست پرکھا تھا۔جیسے وہ عیسائیت کے خلاف تھا،اسی طرح وطنیت اور قومیت کے بھی خلاف تھا۔اس نے اس کو دل کا مرض اا اور خون کا زہر قرار دیا۔یہی وجہ ہے کہ اس کی خواہش تھی کہ یورپ یکجا ہو جائے۔اس کی تصانیف میں یورپین لیگ آف نیشنز کا بھی ذکر آتا ہے جو اس کے خیال میں یورپ کے نیشنلزم کو قابو میں لے آئے گی۔قومیت پرستی کی ایک شاخ جمہوریت کی صورت میں پروان چڑھتی ہے۔اقبال اور نیٹشے دونوں مغربی جمہوریت کے حق میں نہیں تھے۔اقبال کی نگاہ میں جمہوریت دولت مندوں اور طاقت وروں کے ہاتھ میں ایک ہتھیار بن چکی تھی۔وہ کہتے ہیں کہ:

می کند بند غلامان سخت تر
حریت می خواند او را بے بصر

(ایضاً،ص۳۰۶)

جمہوریت کی روشنی پھیلانے والوں نے دوسروں کے ملکوں پر قبضہ شروع کر دیا اور ان کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اقبال کے مطابق بے دین سیاست اور بے دین جمہوریت چنگیزی کے سوا کچھ اور نہیں جس کو محض تہذیب کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔اس میکیاولی (Machavelli) نظریۂ حیات کا نتیجہ اقبال کی نگاہ میں تباہی کے علاوہ کچھ نہیں۔

شب بچشم اہلِ عالم چیدہ است
مصلحت تزویر را نامیدہ است

(ایضاً،ص۲۹۴)

صرف اور صرف توحید ہی ہے جو انسانیت کو قوت پرستی کے اس چنگل سے آزاد کرواسکتی ہے؛ کسی بھی ریاست میں حکومت کا حق صرف اور صرف خدا کو حاصل ہے۔ حل یہ ہے کہ:

اے بہ تقلیدش اسیر، آزاد شو
دامن قرآن بگیر، آزاد شو

(ایضاً،ص۳۰۷)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، نیٹشے بھی جمہوریت کے خلاف ہے۔ کیونکہ وہ عام انسان کو عزت کے قابل نہیں سمجھتا۔ اس کے مطابق عوام میں یہ شعور نہیں ہے کہ وہ اچھا فیصلہ کرسکیں۔ فیصلہ کرنے کا اختیار اعلیٰ ترین نسل کے پاس ہونا چاہیے۔ اقبال نے بھی اسی خیال کے رنگ میں شعر کہا ہے مگر اس سے ہرگز یہ مراد نہ لی جائے کہ اقبال انسانیت کے احترام سے خالی ہیں۔ اسلام تمام انسانیت کو قابلِ احترام قرار دیتا ہے۔ اقبال صرف یہاں تک نیٹشے کا ساتھ دیتے ہیں کہ ہر فیصلے کا اختیار لوگوں کے پاس نہیں ہونا چاہیے۔

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کاری شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

(ایضاً،ص۳۰۸)

یہاں مزید ایک نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اقبال اور اسلام، دونوں رہبانیت کے خلاف ہیں۔ اقبال اس سوچ کا نمائندہ افلاطون کو سمجھتا ہے جس نے کئی قوموں کو زہر کا پیالہ پلا دیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

راہب دیرینہ افلاطون حکیم
از گروہ گوسفندان قدیم

(ایضاً،ص۳۲۴)

اُس نے لوگوں کو اس دنیا سے بھاگنے کا درس دیا اور یہ فلسفہ عیسائی تصوّف کے ساتھ مل کر اسلام میں داخل ہوگیا۔ اس طرح اسلام کے اندر سے قوت کا عنصر مٹتا چلا گیا۔ اس فلسفے کے تحت انسان نے ہستی کو نیستی قرار دیا۔ اس نے زندگی کے درخت کی پھلتی پھولتی شاخیں کاٹ دیں:

قومہا از سکر او مسموم گشت
خفت و از ذوق عمل محروم گشت

یاد رہے کہ جیسے حافظؔ بھی نمائندہ تھا فرسودہ کلام کا، اسی طرح افلاطون پر، اور عیسائیت پر تنقید کا مقصد اُس فلسفۂ حیات کو جڑ سے اکھیڑنا ہے جس کی وجہ سے امتِ مسلمہ زوال سے دوچار ہے۔

نیٹشے کے لیے بھی افلاطون نے قوموں کو زہر پلا رکھا ہے۔ اس کی عیسائیت سے نفرت کی بنیاد بھی یہی ہے۔ نیٹشے سمجھتا تھا کہ کسی دوسری دنیا کا تصور انسان کو توکل اور قناعت پر راضی کر دیتا ہے۔ اس عقیدے کے تحت انسان اس دنیا سے محبت کرنا بھول جاتا ہے۔ وہ سوال کرتا ہے کہ عیسائیت میں وہ کون سی فکر ہے جس سے ہماری لڑائی ہے؟ یہی کہ وہ انسان کی قوت کو توڑ دیتی ہے اور انسان کی اعلیٰ ترین قدروں کو ایسا مرض ہوجاتا ہے کہ وہ خاک میں بدل جاتی ہیں۔ اسی حوالے سے وہ اسلام کی حمایت کرتا ہے کیونکہ اسلام انسان کو قوت بخشتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

> عیسائیت نے تباہ کر دی وہ فصل جو قدیم تھی، بعد ازیں اس نے اسلام کی فصل بھی کاٹ دی۔

(ایضاً، ص ۲۸۹)

یہ یاد رہے کہ اقبال اور نیٹشے کی مخالفت میں بہت فرق ہے۔ نیٹشے تو سراسر منکرِ خدا ہے اور مذہب کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔ اس کے لیے، خدا، جہانِ فردا یا نفس کا کوئی بھی تصور نا قابلِ قبول ہے۔ اقبال کے لیے یہ عقائد انسان کو مقامِ آدمیت پر معمور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عیسائیت بھی قابلِ احترام ہے کیونکہ عیسائیوں کا شمار اہلِ کتاب میں ہوتا ہے۔ نیٹشے اس مقام پر اقبال سے پیچھے رہ گیا کیونکہ اس نے ہر شے کو مادی نقطۂ نگاہ سے پرکھا جب کہ اقبال نے ہر مشکل کا حل توحید میں پایا۔ اس تفریق کو مزید واضح کرنے کے لیے اقبال کا ڈاکٹر نکلسن کو لکھا گیا خط اہم ہے۔ بعض

انگریز نقادوں نے اقبال کے مردِ مومن کو نیٹشے کے سپر مین کی گونج قرار دیا۔ اقبال نے وضاحت کی کہ یہ نقاد غلطی پر ہیں۔ ذرا گہرے مطالعے پر یہ حقیقت نکھر کے سامنے آجائے گی کہ مردِ مومن اور سپر مین میں بہت فرق ہے۔ اقبال کا دعویٰ ہے کہ نیٹشے کو پڑھنے سے کئی سال قبل انھوں نے انسانِ کامل کا تصور صوفیانہ عقیدے میں پایا۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں:

> ...... اور یہ وہ زمانہ ہے جب نہ تو نیٹشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا اور نہ ہی اس کی کتابیں میری نظر سے گذری تھیں......

(اقبال اور مغربی مفکرین، ص۱۱۱)

وہ مزید وضاحت کرتے ہیں کہ نیٹشے کا تصورِ زمان و مکان یکسر غلط تھا۔ اسی وجہ سے ان کے ہاں یہ تصور ہے کہ ہر شے بار بار اس دنیا میں ظہور پذیر ہوتی رہے گی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اقبال نے نیٹشے کے قلبی رجحانات کا اثر لیا مگر فلسفے میں اسے پیچھے چھوڑ دیا۔ بے باکی، بہادری اور سختی کا سبق نیٹشے سے مستعار لیا۔ اس کے تصورِ قوت کو سراہا اور اس کی توانائی کو اپنے تصور میں مناسب مقام دیا۔ دونوں جمہوریت، قومیت پرستی اور رہبانیت سے مخالفت میں ہم خیال تھے اور ایک اعلیٰ ترین انسان کے خواہش مند۔ مگر اقبال اور اس ''مجذوب'' کا راستہ ان خیالات سے آگے جدا ہو گیا۔ اقبال کی قوت حق سے ہے۔ نیٹشے کی قوت محض قوت ہے۔ اقبال عام انسان اور عورت کو قابلِ احترام سمجھتا ہے جب کہ نیٹشے انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ دونوں کے ہیشگی کے تصور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اقبال تقدیرِ یزداں کا آرزومند ہے، جب کہ نیٹشے صرف سپر مین کا بت بنا دیتا ہے۔ اقبال کے لیے خودی ہی سب کچھ ہے۔ نیٹشے کے لیے قوت ہے ہر قدر کا معیار۔ اگر ایک جملے میں بات کہنی ہوتی تو یوں کہتے، کہ اقبال کے تمام تصورات کا انتہائی مظہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور نیٹشے کا آخر فقط سپر مین۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است
رحمۃ للعالمینی انتہا است

کتابیات

آزاد، جگن ناتھ۔اقبال اور مغربی مفکرین۔لاہور: مکتبۂ عالیہ،۱۹۷۸ء۔
ڈار، بشیر احمد۔ *Iqbal and Post-Kantian Voluntarism*۔لاہور: بزمِ اقبال،۲۰۰۰ء۔
عشرت، وحید۔ *Hundred Years of Iqbal Studies*۔لاہور: پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز،۲۰۰۳ء۔
فراقی، تحسین۔بالِ جبریل کا عمیق مطالعہ: ریفرنس پیکج۔جلد دوم۔لاہور: لمز، ۲۰۱۷ء۔

(مہروز بن ایوب لمز کے طالب علم ہیں)

طلحہ علی مدنی

اقبال کا تصورِ زمان ومکان

وقت تاریخ انسانی میں نہایت اہمیت کا حامل رہا ہے۔انسانی زندگی کی پوری داستان وقت کے سمندر ہی سے گذری ہے۔ چنانچہ تقریباً ہر دور کے مفکر نے وقت پر کچھ نہ کچھ تبصرہ کیا ہے۔ چند نے اس کو ایک بہتی ندی کی مانند قرار دیا ہے اور چند نے اس کو ایک پہیے کی مانند سمجھا ہے۔ نہ صرف مفکرین بلکہ مذہبی پیشواؤں نے بھی وقت کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ایک اور تصور جس نے مفکرین کو الجھائے رکھا وہ تصورِ مکان ہے۔ وقت کی طرح مکان کے بارے میں بھی مختلف آرا ہیں اور چند مفکرین نے تو اس کو وقت سے بھی زیادہ اہمیت دی ہے۔

دیگر مفکرین کی طرح اقبال نے بھی زمان و مکان کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انسانی فطرت اور قدرت کا قانون ہے کہ کسی چیز کی جستجو کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ اقبال کا تصورِ زمان ومکان ان کے ''تصورِ الٰہ، تصورِ کائنات، اور تصورِ انسان سے اثر پذیر ہوا ہے۔'' (فراقی، ص۱۵)

وہ سمجھتے ہیں کہ ذاتِ الٰہ اپنی خلقت سے الگ تھلگ نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہر دم ناظر ہے۔

اسی سلسلے میں اقبالؔ فرماتے ہیں:

ما از خدائے گم شدہ ایم او بہ جستجو است
چوں ما نیازمند و گرفتار آرزو است

اقبال کے تصورِ زمان ومکان کی آتش اس وقت اور بھی بھڑک اٹھتی ہے جب وہ زمان کے بارے میں حدیث نبویؐ کا مطالعہ کرتے ہیں:

لا تسبوا الدھر یعنی ''وقت کو برا مت کہو'' (کیونکہ وقت خدا ہے)

اگر ہم تاریخِ انسانی پر نظر ڈالیں اور انسان کا تصورِ زمان و مکان سمجھنے کی کوشش کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ قدیم یونان میں زمان و مکان کے بارے میں ایک خاص تصور تھا جو اس قوم کے تصورِ کائنات سے پیدا ہوا تھا۔ یونانیوں کے مطابق کائنات جمود اور سکوت کا شکار ہے۔ مگر اقبال یونانیوں کے اس تصور کو غلط سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں:

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات

اقبال یونانی تصور کے برعکس کائنات کا ایک حرکی تصور رکھتے ہیں اور انسان کو ایک ذمہ دار مخلوق تصور کرتے ہیں (فراقی، ص ۱۵)۔ یونانیوں کا تصورِ زمان و مکان، جو یونانی تصورِ کائنات سے ماخوذ تھا، کے مطابق یا تو یہ زمان غیر حقیقی ہے یا پھر ایک ہی دائرے میں گردش کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں مشہور یونانی فلسفی افلاطون (Plato) کہتا ہے:

مکان وہ ہے جس میں تمام اجسام واقع ہیں۔ وہ ہمیشہ غیر متغیر ہے کیونکہ اجسام کبھی اپنی صفت نہیں بدلتے۔

جب کہ ایک اور مشہور یونانی فلسفی زینو (Zeno) کے مطابق:

فضا ایک لامتناہی درجے تک قابلِ تقسیم ہے یعنی اس کے کسی حصے کو جس قدر چاہیں چھوٹے اجزا میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ فضا میں حرکت محض ایک فریب نظر ہے۔ (صدیقی، ۴۷)۔

اقبالؔ چونکہ اپنا تصورِ زمان و مکان قرآن مجید اور احادیثِ نبویؐ سے اخذ کرتے ہیں اور یونانی تصور قران کے منافی ہے، اس لیے اقبال بھی یونانی تصور کو غلط سمجھتے ہیں۔ یونانیوں کے دائروی حرکت کے تصور کے بارے میں وہ سمجھتے ہیں کہ اس سے خلاقی ختم ہو جاتی ہے۔ اس بارے میں اقبال فرماتے ہیں:

Eternal recurrence is not eternal creation, it is eternal repetition (Firaqi, 76).

یونانی مفکرین کے اس تصور کی نہ صرف اقبال بلکہ مغربی مفکرین نے بھی تردید کی ہے۔ آرنلڈ جے ٹائن بی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> To our Western minds, the cyclic view of history if taken seriously would reduce history to a tale told by an idiot, signifying nothing (Firaqi, 76).

تصورِ زمان ومکان کو اسلام میں ایک مرکزی حیثیت ملی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلم مفکرین نے ہی موجودہ سائنسی ترقی کی داغ بیل ڈالی۔ اقبال تو مسلمانوں کے لیے تصورِ زمان ومکاں کو زندگی موت کا مسئلہ سمجھتے ہیں اور اس سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں:

> اسلامی تہذیب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص ذہنی مسائل ہوں یا مذہبی نفسیات، سب کا نصب العین اور مقصود یہی ہے کہ لامحدود کو محدود کے اندر سمولیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جس تہذیب کا یہ مقصود ہو اس میں زمان ومکان کا سوال درحقیقت زندگی اور موت کا سوال ہے (اختر، ۴۲۴)۔

جن مسلم مفکرین نے زمان ومکان پر تبصرہ کیا اور اقبال پر گہرے نقوش چھوڑے ان میں ابن خلدون، رازی، عراقی اور اشاعرہ سرِ فہرست ہیں۔ اشاعرہ کے مطابق:

> زمان ایک غیر مسلسل حقیقت ہے، اس فکر کے مطابق کائنات ہر لحہ فنا ہو کر از سرِ نو تخلیق ہوتی ہے (اختر، ۴۱۹)۔

اشاعرہ کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے اقبال فرماتے ہیں:

> اشاعرہ نے زمان ومکان کی لامحدود تقسیم پذیری کے تصور کو رد کر دیا۔ ان کے خیال میں زمان، مکان اور حرکت ایسے اجزا پر مشتمل ہوتے ہیں جن کی مزید تقسیم نہیں ہوسکتی۔ گویا زمان ومکان کے متعلق اشاعرہ کا تصور ایک طرح کا کوانٹم کا تصور ہے۔ اس تصور کی مدد سے انھوں نے زینو کے اس خیال کی تردید کی کہ حرکت ناممکن ہے (صدیقی، ۵۷)۔

اشاعرہ کے تصور کے مطابق زمان مختلف انفرادی آنوں سے مل کر وجود میں آیا ہے۔ یعنی کہ دو آنوں کے درمیان خلا ہے اور یہ کیفیت بے مقصد ہے۔ اس لامعنویت اور اشاعرہ کے معروضی طرزِ مطالعہ کو اقبال تنقید کا نشانہ

بناتے ہیں ۔ اقبال کے نزدیک ''بغیر وقت کی تحلیل کے حرکت کو تصور نہیں کیا جا سکتا (صدیقی، ۶۷)۔'' اقبال کے مطابق وقت کو حرکت پر فوقیت حاصل ہے۔قرآنِ حکیم کے مطابق یہ کائنات ابھی ارتقا کی منازل طے کر رہی ہے یعنی کہ اس میں حرکت ہے۔اقبال نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

اشاعرہ کے علاوہ جس مسلم مفکر نے زمان و مکان کے سلسلے میں اقبال کو متاثر کیا، وہ عراقی تھے۔عراقی نے زمان کی متعدد کیفیات کا تصور دیا۔ ان کے مطابق مادی اور غیر مادی دنیاؤں کے لیے زمان کے علاحدہ علاحدہ درجات ہیں (اختر، ۴۱۹)۔ مادی دنیا کا وقت آسمانی گردشوں کا مرہونِ منت ہے جس میں ماضی، حال اور مستقبل کی تقسیم ہے۔مگر غیر مادی ہستیوں کا زمان اگر چہ گردشوں پر منحصر ہے مگر وہاں کا ایک دن مادی دنیا کے ایک سال کے برابر ہے۔عراقی کا یہ تصورِ تقسیم اقبال تسلیم کرتے ہیں مگر وہ عراقی پر ساتھ ہی ساتھ یہ تنقید بھی کرتے ہیں کہ وہ زمانِ ربانی اور زمانِ مادی میں تعلق سے بے خبر تھا (اختر، ۴۲۰)۔

رازی کے نظریے سے اقبال اتفاق تو نہیں کرتے تھے مگر اس کو سراہتے ضرور تھے۔ رازی کا طریقۂ مطالعہ معروضی تھا جس کو اقبال زمان و مکان کے لیے موزوں نہیں سمجھتے تھے۔اس سلسلے میں اقبال لکھتے ہیں:

> A purely objective point of view is only partially helpful in our understanding of the nature of time.The right course is a careful psychological analysis of our conscious experience which alone reveals the true nature of time (Hassan).

نظریۂ زمان و مکان کے سلسلے میں اقبال نے نہ صرف مشرقی بلکہ مغربی مفکروں سے بھی فیض حاصل کیا۔ان میں نیٹشے، برگساں، McTaggart، نیوٹن اور آئن سٹائن سرِ فہرست ہیں۔اقبال کی خاص بات یہ ہے کہ وہ دیگر مفکرین کا علم بغیر پرکھے قبول نہیں کرتے اور یہی طریقہ اقبال نے مغربی مفکرین کے ساتھ برتا ہے۔

اس سلسلے میں نیوٹن کا تصورِ زمان قابلِ غور ہے۔ نیوٹن کے مطابق زمان ایک مطلق شے ہے جو کہ مسلسل بہاؤ

کی کیفیت میں ہے (صدیقی، ۸۰-۸۱)۔ اقبال نے نیوٹن کے بارے میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا:

> اگر ہم وقت کو ایک ندی کے بہاؤ کے طور پر سمجھنے کی کوشش کریں تو پھر ہم اس کی ابتدا، انتہا اور حدود کو نہیں سمجھ سکتے۔ نیز یہ کہ اگر وقت کی ماہیت سوائے اس کے کچھ نہ ہو کہ اس کو چند الفاظ یعنی بہاؤ، حرکت یا گذران سے کامل طور پر معین کیا جا سکے تو اس سے پہلے وقت کو شمار کرنے کے لیے ہمیں ایک اور وقت کی ضرورت ہوگی جب کہ اس دوسرے وقت کو شمار کرنے کے لیے ایک اور تیسرے وقت اور اس طرح یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا (صدیقی، ۸۱)۔

جرمنی کے مشہور فلسفی نیٹشے نے بھی اس ضمن میں اپنا خیال پیش کیا۔ نیٹشے کے مطابق وقت داخلی نہیں بلکہ وہ دراصل ایک زبردست حقیقت ہے جس کا ادراک پھیروں سے ہوتا ہے۔ اس کے مطابق وقت ایک گھومنے والے پہیے کی طرح ہے، جس کا ہمیں نہ آغاز پتا ہے اور نہ ہی اختتام۔ اس سے ہم یہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ ابھی جو کچھ دنیا میں ہے وہ پہلے بھی ہو چکا ہے اور پھر دوبارہ بھی ہوگا۔ یعنی کہ وقت خود گردش میں ہے۔ بقول نیٹشے:

> All things recur eternally and we ourselves with them, and that we have already existed an infinite numbers of times before and all things with us (Hassan).

اقبال نیٹشے کے برعکس وقت کی تخلیقی قوت میں ایمان رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق تخلیق ہی زمان کی بنیادی صفت ہے۔ اسی سلسلے میں اقبال نے مردِ مومن کی شان بیان کرتے ہوئے کہا:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

نیٹشے کا گردشی تصور اسلام کے تصورِ زمان سے بھی متضاد دکھائی دیتا ہے۔ جہاں اسلام ہر لمحہ حال ''Eternal Now'' کی بات کرتا ہے وہیں نیٹشے گردشی تصور لاتا ہے جو اسلام کے منافی ہے۔ اقبال ایک فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مردِ قلندر بھی تھے اور اسی لیے انھوں نے نیٹشے کا تصور قبول نہیں کیا۔

برگساں کے نظریے نے بھی اقبال کو بے حد متاثر کیا اور انھوں نے بہت حد تک برگساں کے خیالات کو قبول

بھی کیا۔ برگساں کے مطابق:

Time is ceaseless, continuous flow in which all things live and move and have their being (Hassan).

برگساں کا کمال یہ تھا کہ اس نے زمانۂ خاص کا نظریہ پیش کیا جس کے اقبال بھی قائل تھے۔ برگساں کے مطابق زمانۂ خالص ہمیشگی کا نام ہے جس میں وقت کی تقسیم یعنی کہ وقت کا حال، مستقبل اور ماضی میں بانٹا جانا، کوئی معنی نہیں رکھتا۔ برگساں کے مطابق فاعل انا (ego efficient) زمانِ مادی (maternal time) میں ہے جب کہ عاقل انا (appreciate ego) زمانۂ خالص (pure duration) میں ہے۔

اقبال برگساں کے نظریۂ وجدان سے بھی قائل ہیں جس کے مطابق زمانۂ خالص تک رسائی وجدان کے ذریعے ہے اور وجدان کی یہ کیفیت صرف اسی وقت پائی جاسکتی ہے جب فاعل انا عارضی طور پر موقوف ہو۔ برگساں نظریۂ تخلیق کا پیروکار تھا۔ اس کے مطابق:

If time is real and not a mere repetition of homogenous moments which makes concious experience a delusion then every moment in the life of reality is original, giving birth to what is absolutely novel and unforeseeable. To exist in real time is not to be bound by the fetters of serial time, but to create it from moment to moment and to be absolutely free and original in creation - creation is opposed to repetition which is characteristic of mechanical action. That is why it is impossible to explain the creative activity of life in terms of mechanism (Hassan).

جہاں اقبال برگساں کے فلسفیانہ خیالات سے اتفاق کرتے ہیں وہیں وہ برگساں کے چند خیالات کو تنقید کا نشانہ بھی بناتے ہیں۔ مثلاً اقبال برگساں کی وقت کی مقصدیت کے انکار کو پسند نہیں کرتے (اختر، ۴۲۰)۔ برگساں کے

مطابق، ہمیں زمان کا احساس تغیر اور حرکت سے ہی ہوتا ہے (صدیقی، ۹۵)۔ مگر اقبال زمان کو بے مقصد نہیں سمجھتے اور ان کے نزدیک زمان کا مقصد تخلیق کو جاری رکھنا ہے۔

اقبال اپنے زمانے میں ہونے والے واقعات سے باخبر رہا کرتے تھے۔ اگرچہ ان کے مضامین تو شاعری اور فلسفہ تھے مگر وہ خود کو زمانے کی تبدیلیوں سے آگاہ رکھتے تھے۔ اس کی مثال ہمیں اقبال کی آئن سٹائن پر تنقید سے نظر آتی ہے۔ آئن سٹائن بیسوی صدی کا ایک مشہور سائنسدان رہا ہے جس نے زمان و مکان میں اضافت کا نظریہ پیش کیا۔ آئن سٹائن کے نزدیک مطلق مکان اور مطلق زمان کا تصور ناممکن ہے (صدیقی، ۸۳)۔ آئن سٹائن نے نظریاتی اور تجرباتی بنا پر یہ ثابت کیا کہ زمان اور مکان اضافی ہیں۔ اس کے ساتھ اس نے یہ بھی واضح کیا کہ زمان اور مکان ایک دوسرے سے علاحدہ نہیں بلکہ ایک دوسرے پر منحصر ہیں (صدیقی، ۸۳)۔ آئن سٹائن کی تحقیق نے دنیا کو یہ ماننے پر مجبور کر دیا کہ ہماری دنیا چار ابعادی (four dimensional) ہے۔ کیونکہ کائنات محض مقاموں اور نقطوں کا مجموعہ نہیں بلکہ واقعات پر مشتمل ہے۔ کسی واقعے کو معین کرنے کے لیے صرف اس کے جائے وقوع کا بیان کرنا کافی نہیں بلکہ یہ بھی بتانا لازم ہے کہ واقعہ کس وقت ظہور میں آیا۔ اس طرح واقعے کے تعین کے لیے چار بعاد یعنی طول، عرض، بلندی اور وقت کے معلوم ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، اور اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہماری دنیا، جو واقعات کی دنیا ہے، چار ابعادی ہے۔

اسی سلسلے میں علامہ اقبال نے ایک خط میں لکھا:

> یہ ممکن ہے کہ مکان کے ابعاد (dimensions) تین سے زیادہ ہوں اور ہمارے اسلامی صوفیہ تو ایک مدت سے تعدد زمان و مکان کے قائل ہیں (فراقی، ۲۰)۔

اقبال آئن سٹائن کے نظریے کے دیگر پہلوؤں سے بھی قائل ہیں مثلاً آئن سٹائن اپنے نظریے کے ذریعے یہ واضح کرتا ہے کہ قوت (انرجی) بھی ایک وجود رکھتی ہے جو کہ ہمیں وزن کی صورت میں نظر آتی ہے (صدیقی، ۹۲)۔ اس انکشاف نے مادیت کا خاتمہ کر دیا اور دہریوں کو منہ توڑ جواب دیا۔ قرآن کی آیت اللّٰہ نور السموٰت والارض اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اقبال فرماتے ہیں:

> اس طرح ہمیں معلوم ہو گیا کہ قدیم طبیعیات کی مادیت کا سرے سے وجود ہی نہیں ۔ نظریۂ اضافت نیچر کو معدوم نہیں کرتا بلکہ مادے کے متعلق اس تصور کا خاتمہ کرتا ہے کہ مادہ نیچر میں خود بخود پھیلا پڑا ہے۔ اسی تصور نے قدیم طبیعیات کو مادیت کے غبار میں دھکیلا تھا (صدیقی، ۹۳)۔

اقبال نے نظریۂ اضافت کے تقریباً تمام ہی پہلوؤں کو قبول کیا سوائے ایک کے کہ زمان مکان کی چوتھی بُعد ہے۔ اقبال کے نزدیک اگر زمان مکان کی چوتھی بُعد ہے تو زمان کی تخلیقی حرکت ختم ہو جاتی ہے اور دوبارہ سے جبریوں کا خیال، کہ تقدیر ہی اصل حقیقت ہے، گردش کرنے لگتا ہے۔ اقبال وقت کی تخلیقی حرکت پر اعتقاد رکھتے ہیں اور وہ زمان کو اساسی قرار دیتے ہیں (صدیقی، ۹۳۔ ۹۴)۔ اقبال کے نزدیک تو:

> The Future certainly pre-exists in the organic whole of God's creative life, but it pre-exists as an open possibilty, not as a fixed order of events with defined outlines (Hassan).

مگر اقبال کا وقت کو زمان کی چوتھی بُعد سمجھ لینا دراصل ان کی غلط فہمی تھی۔ درحقیقت، نظریۂ اضافت وقت کو زمان و مکاں سلسلے کی چوتھی بُعد قرار دیتا ہے (صدیقی، ۹۴)۔ لہٰذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ نظریۂ اضافت وہی خیالات ثابت کرتا ہے جن کو اقبال اپناتے ہیں۔

اقبال کا تصورِ زمان و مکان جاننے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید اور احادیث کے علاوہ انھوں نے عراقی، برگساں اور آئن سٹائن کے نظریات قبول کیے ہیں۔ عراقی کے ساتھ اختلاف ہیں مگر اس کا نظریہ اپنے تصور کا حصہ بناتے ہیں۔ اسی طرح برگساں کی وقت کی مقصدیت پر تنقید تو کرتے ہیں مگر اس کا زمانۂ خالص کا نظریہ قبول کرتے ہیں۔ آئن سٹائن کے ساتھ موجود ان کی غلط فہمی اگر رفع کر دی جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک طرح سے آئن سٹائن کے ہی پیروکار ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ہے کہ اقبال کے نزدیک سائنس اشیا کی ماہیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی ۔ اس بات کو بھولنا نہیں چاہیے کہ نظریۂ اضافت زمان کی بعض ایسی

خصوصیات کو نظر انداز کر دیتا ہے جو ہم پر گذرتی ہیں۔اس لیے یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ زمان کی ساری ماہیت صرف ان خصوصیات پر مشتمل ہے جو نظریۂ اضافت میں بیان کی جاتی ہیں کیونکہ یہ نظریہ قدرت کے صرف ان پہلوؤں پر غور کرتا ہے جن پر ریاضیاتی نقطۂ نظر سے بحث کی جاسکتی ہے (صدیقی،۹۵)۔

آخر کار، اقبال تصور زمان و مکان کو تصورِ خودی سے جوڑتے ہیں اور دو اصطلاحیں ''عاقل انا'' (appreciative ego) اور ''فاعل انا'' (efficient ego) پیش کرتے ہیں۔اقبال کے نزدیک زندگی اور کائنات وقت میں موجود ہیں (اختر،۴۲۱)۔اس سلسلے میں وہ قرآن حکیم سے ایک آیت کو بطور دلیل حاصل کرتے ہیں:

> اس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمینوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، چھے دنوں میں اور پھر قائم ہوا عرش پر (القرآن)۔

اقبال برگساں سے اتفاق کرتے ہوئے یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ شعور گہرے داخلی تجربوں سے ہوتا ہوا یہ انکشاف کرتا ہے کہ زمانۂ خالص دراصل ہمیشگی ہے جس میں ماضی، حال میں آتا ہے اور محرک بنتا ہے (اختر،۴۲۱)۔

> (Reality is) pure duration in which thought life and purpose interpenetrate to form an organic unity (Hassan).

اس نامیاتی وحدت کے عالم میں جیسے ماضی حال پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح حال آئندہ مستقبل کی سمت کا تعین کرتا ہے مگر یہ یاد رہے کہ مستقبل کوئی متعین شے نہیں بلکہ ایک کھلے ہوئے امکان کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ مستقبل کے یہ امکانات اقبال کو تقدیر جیسے مسئلے تک لے جاتے ہیں مگر یہاں وہ قرآن اور اپنی تحقیق سے صحیح نتیجہ ڈھونڈتے ہیں۔تقدیر کی وضاحت وہ قرآن سے ہی کرتے ہیں۔ان کے مطابق:

> قرآن پاک نے جس چیز کو تقدیر کہا ہے وہ زمان ہی ہے جب کہ اس کو عضوی کل پر دیکھا جائے۔ تقدیر وہ زمان ہے جب کہ اس کے امکانات کے ظہور سے قبل اس پر غور کیا جائے۔ ہر آنے والا لمحہ نہ صرف نیا ہوتا ہے بلکہ اس کے متعلق پیشن گوئی کرنا ناممکن ہے۔ دوران کی کیفیت کو محفوظ کرنے کا ذریعہ انسانی حافظہ ہے (صدیقی،۹۷)۔

اسی سلسلے میں اقبال فرماتے ہیں:

ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

یعنی کہ خودی اپنی انتہا پر خدا ہے اور خودی کے ذریعے جب بندہ زمانۂ خالص کا لطف لے تو وہ مادی وقت کا راکب بن جاتا ہے۔ لہٰذا انسان خود کو مادی وقت کے بندھنوں سے چھڑا لے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب بندہ خدا کی محبت میں خودی کے اس مقام پر پہنچ جائے کہ وہ زمانۂ خالص کا لطف لے سکے۔ اسی طرح ایک اور جگہ اقبال فرماتے ہیں:

خودی ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ

اقبال نے زمانِ طبعی اور زمانِ خالص کے مابین جو تعلق قائم کیا ہے اس سے انکشاف ہوتا ہے کہ زمان و مکان انتہائی خودی کے مقامات ہیں اور حیات و کائنات زمان میں ہی واقع ہیں۔ زمان کی حیثیت اساسی ہے اور ایک مقام پر زمان ہی خدا ہے۔

کتابیات

اختر، سلیم (مرتب)۔ علامہ اقبال حیات ، فکر و فن ۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔
صدیقی، رضی الدین۔اقبال کا تصور زمان و مکان اور دوسرے مضامین۔لاہور: مجلس ترقی ادب،۲۰۱۴ء۔
فراقی، تحسین۔ جہات اقبال ۔لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۹۳ء۔

برقی ماخذ

Hassan, Riffat. The Concept of Time in Iqbal's Thought. available at: <riffathassan.info/wp-content/>

(طلحہ علی مدنی لمز کے طالب علم ہیں)

ظفر علی حبیب

انتظار حسین اور کافکا کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ

انتظار حسین کی کہانی ''کایا کلپ'' ایک شہزادے کی کہانی ہے۔لیکن پہلا جملہ پڑھتے ہی قاری کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کسی شہزادے اور شہزادی کی محبت کی داستان نہیں؛

شہزادہ آزاد بخت نے اُس دن مکھی کی صورت صبح کی ......

شہزادہ آزاد بخت جو کہ ایک شہزادی کو سفید دیو کے قلعے سے بچانے آیا تھا، خود کو ایک روز مکھی کی صورت میں پاتا ہے۔جس کے بعد وہ حقیقت اور خواب کی پہچان کی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔دن کے اُجالے میں وہ انسان ہی رہتا ہے لیکن رات کو جب دیو دھاڑتا ہوا اپنے قلعے میں واپس آتا ہے تو شہزادہ ایک مکھی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔اس تبدیلی کی وجہ خوبصورت شہزادی ہوتی ہے جو آزاد بخت کو دیو سے بچانے کے لیے اُسے ایک منتر کے ذریعے مکھی بنا دیتی ہے اور دن میں دوبارہ منتر پھونک کر اُسے انسان کے روپ میں لوٹا دیتی ہے۔پہلے تو شہزادے کی مردانہ غیرت اِس بات کو ہضم نہ کر پائی کہ وہ ایک عورت کے رحم و کرم پر رہے لیکن پھر شہزادی کی خوبصورت آنکھوں میں موجود آنسو اُس کا دِل پگھلا دیتے ہیں۔یوں گویا شہزادہ قلعے میں قید سا ہو جاتا ہے۔روز مکھی سے انسان اور انسان سے پھر مکھی میں تبدیل ہوتے ہوتے وہ ایک دن خود کو مکمل طور پر کھو بیٹھتا ہے اور مستقل ایک مکھی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

انتظار حسین نہایت ہی نفاست سے ایک ایسے انسان کی کہانی پیش کرتے ہیں جو لمحہ بہ لمحہ اپنی ذات اور آزادی کو یوں کھو دیتا ہے کہ ایک دن وہ خود کو پہچاننے سے ہی بالاتر ہو جاتا ہے۔مصنف کی یہ کہانی جرمن مصنف فرانز کافکا کی تحریر ''میٹامورفیسز'' (کایا کلپ) سے متاثر نظر آتی ہے۔

ایک صبح جب گریگر سامسہ شورش زدہ خواب سے بیدار ہوا، تو اُس نے خود کو اپنے بستر

میں کیڑے کی شکل میں تبدیل پایا۔

کافکا کی ’’کایا کلپ‘‘ گریگر سامسہ کی کہانی ہے۔ گریگر ایک دن نیند سے جاگ کر خود کو کیڑے کی شکل میں تبدیل پاتا ہے۔ گریگر سیلز مین کی نوکری پر مامور اپنے والدین اور اکلوتی بہن کا واحد سہارا ہوتا ہے۔ کیڑے میں تبدیل ہونے کے بعد بھی گریگر انسانی احساسات اور خیالات رکھتا ہے۔ اِس تبدیلی کے سبب وہ اپنے باپ کی نفرت کا نشانہ بن جاتا ہے جب کہ اُس کی بہن اور ماں اُس سے ہمدردی رکھتی ہیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ گریگر کی ذات اُس کے گھر والوں کے لیے معاشی اور سماجی تکلیف کا باعث بن جاتی ہے۔ آخر گریگر کو ایک کمرے میں بند کیا جاتا ہے جہاں وہ خود کو بھوکا رکھ کر اپنی جان لے لیتا ہے۔ گریگر کی موت گھر والوں کے لیے ایک نئ زندگی کا باعث بنتی ہے۔

کافکا اور انتظار دونوں ہی انسان کی ذات اور اس کی شناخت کی موت کا ماتم کرتے نظر آتے ہیں۔ شہزادہ آزاد بخت اور گریگر سامسہ دونوں اپنی ذات کی شناخت کو دنیا کے سامنے کھو بیٹھتے ہیں جس کے بعد وہ ایک مکھی یا ایک کیڑے کی شکل دھار لیتے ہیں۔ ایک حقیر سی شے بن جاتے ہیں اور جب وہ یہ جان جاتے ہیں کہ اُن کی ذات وحیات کے اب کوئی معانی نہیں رہے تو وہ موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

گریگر اور آزاد بخت دونوں ہی وجود کی شناخت کے متلاشی ہیں۔ دونوں ہی نظریۂ وجودیت سے دوچار ہیں:

> اُس نے اپنے آپ کو بار بار دیکھا اور کہا میں آدمی نہیں ہوں۔ تو پھر میں مکھی ہوں؟ مگر اُس وقت وہ مکھی بھی نہیں تھا۔ تو میں آدمی بھی نہیں ہوں، میں مکھی بھی نہیں ہوں۔ پھر میں کیا ہوں؟ شاید میں کچھ بھی نہیں ہوں۔

آزاد بخت خود کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ شب و روز بدلتی حالت آزاد بخت کو اپنی شناخت سے جدا کر دیتی ہے۔ اُس کی شناخت جیسے سفید دیو کے قلعے میں کہیں کھوگئی ہے۔ شہزادی کو بچانے کی بجائے آزاد بخت خود قید ہو گیا ہے۔ شہزادہ آزاد بخت اپنی آزادی اور اپنی ذات کا سودا خود ہی اُس وقت کر لیتا ہے جب وہ شہزادی کی بات مان کر ہر شام مکھی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اِس تبدیلی میں وہ اتنا گر جاتا ہے کہ وہ اپنا نام و نسب ہی بھول جاتا ہے۔ ’’نام! اُس نے کہا حقیقت کی کنجی ہے، میری حقیقت کی کنجی کہاں ہے۔‘‘

گریگر سامسہ بھی ایسے ہی اپنی شناخت کا متلاشی پھرتا ہے۔ گریگر اپنی ذات کو دبوچتے ہوئے ایک مشین کی مانند کام کر کے اپنے گھر والوں کو خوش رکھتا ہے۔ لیکن اندر ہی اندر وہ اپنی ذات کی تسکین اور سماج کی تسکین کے درمیان کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ یہ کشمکش اُسے ایک کیڑا بنا دیتی ہے اور وہ خود کو دیکھ کر بلک اُٹھتا ہے: ''یہ مجھے کیا ہو گیا؟'' جیسے وہ خود کو پہچان ہی نہ پا رہا ہو۔

شہزادہ آزاد بخت اور گریگر کے درمیان فرق یہ ہے کہ آزاد بخت اپنی ذاتی آزادی و شناخت کو اپنی مرضی سے گنوا دیتا ہے۔ اسی لیے رومانوی کہانیوں کے برعکس نہ ہی شہزادہ سفید دیو کو شکست دینے میں کامیاب ہوتا ہے اور نہ ہی شہزادی کو دیو کی قید سے رہائی دِلا پاتا ہے۔ بلکہ خاموشی سے اپنی ڈھلتی ہوئی ذات کو تسلیم کیے جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات اور اپنی پہچان کو برقرار رکھنے کی بجائے وقت کے ساتھ ساتھ اُسے لمحہ بہ لمحہ کھوتے دیکھتا ہے۔ وہ ہر شام دیو کے ڈر سے سمٹ کر مکھی بن جاتا ہے اور دن کو شہزادی کی پھونک سے انسانی حالت میں واپس آ جاتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ وہ اپنی شناخت کو گنواتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک دن وہ شہزادی کی پھونک کے بغیر ہی مکھی میں تبدیل ہو گیا۔ یہ ظاہری تبدیلی دراصل اندرونی تبدیلی کا ہی استعارہ ہے۔

گریگر سامسہ کا ایک صبح کیڑے میں تبدیل ہونا، اُن سماجی اور دنیاوی قواعد و ضوابط کا جبر ہے جن کی قیمت ذات کی گم شدگی ہے، ایسی تبدیلی اندرونی اضطراب کی عکاسی کرتی ہے جس کے تحت وہ سماجی بیڑیاں اُتار کر اپنی ذات کی کھوج لگانا چاہتا ہے۔ وہ اپنی بے معنی زندگی کو معنی دینا چاہتا ہے۔ لیکن گریگر کے پاس دنیا اور سماج کے بے معنی چنگل سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے جس کے ذریعے وہ اپنی ذات کا حصول ممکن بنا سکتا ہے اور وہ ہے موت۔ کافکا کے مطابق ''آگاہی کی ابتدا کی پہلی نشانی موت کی خواہش ہے۔''

کافکا اور انتظار حسین دونوں نے ہی انسان کی ذات، اس کی پہچان، اس کی شناخت اور اس کی خودی کی اہمیت کو بڑی خوبصورتی سے اُجاگر کیا ہے۔ دونوں کہانیاں بے شناخت بھٹکے ہوئے انسان کا رونا روتی ہیں۔

گریگر سامسہ دنیا اور سماج کو جکڑتی ہوئی زنجیروں میں قید خود کو ڈھونڈتا ہے اور اس فانی اور بے معنی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ جب کہ شہزادہ آزاد بخت اپنے نام کے برعکس سفید دیو کے ڈر سے سمٹا ہوا اپنی شناخت کھو دیتا

ہے اور اسے واپس پانے کی بجائے اپنی شخصیت کا سودا مکھی کے روپ میں کر لیتا ہے۔

اور وہ ظلم کی صبح تھی کہ جو ظاہر تھا چھپ گیا اور جو چھپا ہوا تھا وہ ظاہر ہو گیا، تو وہ ایسی صبح تھی کہ جس کے پاس جو تھا وہ چھن گیا اور جو جیسا تھا وہ ویسا نکل آیا۔ اور شہزادہ آزاد بخت مکھی بن گیا۔

(ظفر علی حبیب لمز کے طالب علم ہیں)

یسریٰ جمیل

سماجی مسائل اور منٹو کے افسانے

منٹو کو اس کی حقیقت نگاری، نفسیاتی موشگافیوں، دور بین و دوررس نگاہ، جرأت آمیز اور بے باکانہ حق گوئی، سیاست، معاشرت اور مذہب کے اجارہ داروں پر تلخ لیکن مصلحانہ طنز اور مزے دار مکالموں کی وجہ سے سراہا گیا ہے۔ منٹو نے سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور ان سب سے بڑھ کر حقیقی زندگی پر اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں نظر ڈالی جس پر اسے مطعون کیا گیا ہے۔ داد و تحسین کے معاملے میں منٹو کے حوالے سے لوگوں کا جو منفی رویہ رہا ہے اس میں کسی حد تک حق پسندی اور توازن بھی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ افراط و تفریط کا جذبہ غالب نظر آتا ہے۔

منٹو ایک سچا، دیانت دار، اور فطری فن کار تھا۔ اس نے جو کچھ لکھا، بھرپور خلوص اور ایمان داری سے لکھا۔ منٹو میں اظہار کی مسلسل تڑپ تھی۔ ایک شدید اندرونی لگن، اور ایک آگ تھی جس میں وہ ہمیشہ تپتا رہتا تھا۔ ایسا جنون کسی بھی فن کار کی بقا کے لیے بے حد ضروری ہے۔

افسانہ نگاری منٹو کی گھٹی میں پڑی تھی اور ان کا قلم انھیں خود بخود لکھنے پر آمادہ کرتا تھا۔ منٹو کے اپنے الفاظ ہیں کہ وہ افسانہ نہیں لکھتے تھے بلکہ افسانہ انھیں لکھتا تھا۔ افسانہ لکھنا ان کے لیے اتنا ہی اشد اور ناگزیر تھا جتنا کہ سونا، نہانا، کھانا یا سگریٹ اور شراب پینا۔ ان کی رگوں میں گویا خون نہیں روشنائی رواں دواں تھی۔ تخیلات گھٹا بن کر آتے اور ان کا قلم برس پڑتا۔ اگر وہ افسانہ نہ لکھتے تو ان کو یوں محسوس ہوتا کہ کوئی ضروری چیز نامکمل رہ گئی ہے...... گویا انھوں نے کپڑے نہیں پہنے یا ڈاڑھی نہیں مونڈی۔ خلاصہ یہ کہ منٹو اور افسانہ لازم و ملزوم تھے۔

منٹو نے معاشرے کی بدی، بدصورتی اور گندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور زندگی کے فریب کو اس طرح چکھا کہ اس کی تلخی کام و دہن سے گذر کر رگ و پے میں اتر گئی۔ زندگی کے مشاہدے اور تجربے میں منٹو نے اپنے آپ کو موی

شمع کی طرح پگھلایا اور زندگی کے ایسے پہلوؤں کو پوری جرأت، بے باکی اور بے رحم صداقت کے ساتھ پیش کیا جنھیں چھونے کی ہمارے ہاں بہت کم ادیبوں نے جرأت کی۔

منٹو کی تحریروں میں ذہنی غلامی اور سماجی نظامِ جبر کے خلاف احتجاج اور روایتی خیالات سے انکار کا رویہ تھا۔ منٹو انسان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو بیان کرنے اور گفتار و کردار کے فرق کو آئینہ دکھانے کی سعی بھی کرتے رہے اور اُنھوں نے انسانی جذبات کی نیرنگیوں کا نقشہ بھی کھینچا۔ لیکن جذبات سے زیادہ منٹو نے انسانی فطرت کے خارجی حالات اور نفسیاتی عوامل کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

منٹو کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۶ء کی نئے ادب کی تحریک سے ہوا تھا۔ نئے ادب کی یہ تحریک ایک باغی تحریک تھی جس کی بنیاد انحراف پر تھی۔ سامراجی حکومت، مروجہ معاشرتی نظام اور ادب میں رومانی روایت کے خلاف اس تحریک نے اظہار کے نئے اسلوبِ واقعہ نگاری اور معاشرتی حقیقت نگاری کے نئے رجحان متعارف کروائے۔ منٹو اس تحریک کا سب سے اہم ادیب تھا۔ منٹو کی بغاوت اس سماج کے خلاف تھی جس کی عائد کردہ پابندیاں اور موجودہ تہذیب کا ملمع اور تصنع، فطری اور صحت مند نشوونما کو روکتے ہیں۔ باغی منٹو نے اس موضوع کا انتخاب کیا جو سماج کی نظر میں taboo تھا یعنی کہ جس کو اپنی تحریر کا موضوع بنانا حقیر سمجھا جاتا تھا۔

اس سلسلے میں ہم منٹو کا افسانہ ''ہتک'' دیکھ سکتے ہیں جس کا مرکزی خیال ہی نسائیت کی تحقیر و تذلیل کا ردِ عمل ہے۔ منٹو بتاتے ہیں کہ سوگندھی ایک بازاری عورت ہے؛ رات کے دو بجے رام لال دلال آتا ہے اور وہ بن سنور کر اس کے ساتھ ہو لیتی ہے۔

سوگندھی ساڑھی کا ایک کنارہ اپنی انگلی پر لپیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور موٹر کے دروازے کے پاس کھڑی ہوگئی۔ سیٹھ جی نے بیڑی اس کے چہرے کے پاس روشن کی۔ ایک لمحے کے لیے اس روشنی نے سوگندھی کی خمار آلود آنکھوں میں چکا چوند پیدا کی۔ بٹن دبانے کی آواز پیدا ہوئی اور روشنی ہوگئی۔ ساتھ ہی سیٹھ کے منہ سے ''اونہہ'' نکلا۔ پھر ایک دم موٹر کا انجن پھڑ پھڑایا اور کار یہ جا وہ جا...... سوگندھی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوا ہے۔ رام لال ''اونہہ'' کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے: ''پسند نہیں کیا تجھے......'' اور آہستہ آہستہ سوگندھی پر 'اونہہ' کی وضاحت کھلنے لگی ہے۔ وہ اس کو

اپنی نسوانیت کی ہتک اور تذلیل سمجھتی ہے، وہ محسوس کرتی ہے کہ اس کو دھتکارا گیا ہے اور اس کے منہ پر تھوکا گیا ہے۔

لیکن منٹو ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی بتاتے ہیں کہ سوگندھی حساس، خوددار، نیک سیرت، خوش طبع اور رحمدل ہے۔ اس کی انا اور خودداری کی چنگاری اس کے پیشے کی راکھ تلے دبی ہوئی ہے۔ وہ کسی گاہک کو ناخوش نہیں لوٹاتی۔ کہنے کو تو سوگندھی کو مردوں کوڑ خانے کے سب گُر آتے ہیں لیکن وہ حددرجہ جذباتی ہے۔ کوئی گاہک جب اس سے پریم کے دو میٹھے بول بولتا ہے اور دو چار کومل کومل باتیں کرتا ہے تو وہ پگھل جاتی ہے، موم ہو جاتی ہے۔ وہ وقتی طور پر اس کے پریم کی قائل ہو جاتی ہے اور جذبات کی رو میں بہہ جاتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ کوئی اس سے پیار کرے اور وہ کسی سے پیار کرے۔ وہ بازاری عورت ہوتے ہوئے بھی جنسی طور پر ناآسودہ ہے۔

منٹو نے یہاں ایسی روایتوں پر سوال نہیں اٹھایا جو غیر اخلاقی ہیں بلکہ منٹو ایسے افراد کے بارے میں بات کرتا ہے جنھیں ہمارا معاشرہ انسان ہی نہیں سمجھتا۔ منٹو سوگندھی کی مثال دیتے ہوئے بتاتا ہے کہ اگرچہ وہ طوائف ہے لیکن اس میں انسانوں والے جذبات ہی ہیں۔ سوگندھی حساس ہے اور دوسروں کا دکھ درد اسے متاثر کرتا ہے۔ وہ دوسروں کی مدد کرتی ہے لیکن اس ایک 'اونہہ' کی وجہ سے وہ اپنے آپ سے سوال کرتی ہے کہ جب اس نے کسی سے برا سلوک نہیں کیا تو اس کی تضحیک کیوں؟

''سوگندھی...... تجھ سے زمانے نے اچھا سلوک نہیں کیا!'' جب اسے کوئی جواب نہیں ملتا تو اسے ساری مرد ذات خودغرضی اور مطلب پرستی کا مجسمہ دکھائی دینے لگتی ہے۔

''ہتک'' کا انجام قاری کو چونکا دیتا ہے۔ جو چیز ہتک کو عظمت بخشتی ہے وہ ایک طوائف کے شب و روز کی تصویر ہے جس میں ہم اپنے معاشرے اور سماجی نظام کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ ''ہتک'' ہمارے معاشرے پر بڑا گہرا طنز ہے، ایک ایسا معاشرہ جس میں عورت پیٹ کی خاطر دس روپے کے عوض اپنے جسم کو ہر کس و ناکس کو بیچ دیتی ہے جس میں سے اڑھائی روپے دلال لے جاتا ہے اور اس کے لیے صرف ساڑھے سات روپے رہ جاتے ہیں۔ جہاں تک گاہکوں کا تعلق ہے، اس میں اس کی پسند اور ناپسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ معاملے میں وہ کبھی ناک بھوں نہیں چڑھاتی، ماتھے پر بل نہیں ڈالتی۔ ڈال ہی نہیں سکتی کیونکہ گاہک ہی اس کی روٹی روزی کا وسیلہ ہیں۔ وہ ان سے نفرت

کرنے لگے تو بھوکی مرجائے۔ یہ طوائف کی زندگی کا المیہ ہے کہ جب تک یہ سرمایہ دارانہ نظام رہے گا عورت کی یوں ہی ہتک ہوتی رہے گی۔ وہ اپنا تن چند سکوں کی خاطر غلیظ سے غلیظ آدمی کو پیش کرتی رہے گی۔ یہ عکاسی ''ہتک'' میں موجود عظمت اور ترقی پسند پیغام کو ظاہر کرتی ہے۔

منٹو نے یہ ایک اہم سماجی مسئلہ قاری کے سامنے رکھا ہے جہاں ہمارا سماج طوائف کو انسان تک نہیں سمجھتا اور ناک پر رومال رکھ لیتا ہے۔ منہ بھر لیتا ہے لیکن اندھیرے اجالے میں ہمارے سماج کے ''بلند مقام'' سفید ریش بزرگ ان کے دروازے پر دستک بھی دیتے رہتے ہیں۔

اسی سلسلے میں ہم منٹو کا ایک اور افسانہ ''خوشیا'' دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا بنیادی موضوع مردانہ وقار کی تذلیل ہے۔ افسانے میں منٹو بتاتے ہیں کہ خوشیا رنڈیوں کا دلال ہے۔ جب وہ کانتا کے دروازے پر دستک دیتا ہے تو اندر سے آواز آتی ہے: ''کون ہے؟'' اس پر خوشیا جواب دیتا ہے ''میں خوشیا۔'' تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلتا ہے اور خوشیا انداز داخل ہوجاتا ہے اور کانتا اندر سے دروازہ بند کرلیتی ہے۔ خوشیا مڑ کر دیکھتا ہے تو ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ خوشیا نے پہلی بار عورت کو یوں اچانک عریاں دیکھا تھا۔ بے چینی اور اضطراب کے عالم میں وہ کانتا سے کہتا ہے ''جب تم ننگی تھی تو دروازہ کھولنے کی کیا ضرورت تھی...... اندر سے کہہ دیا ہوتا میں پھر آجاتا۔''

کانتا مسکرا کر جواب دیتی ہے: ''جب تم نے کہا 'خوشیا' تو میں نے سوچا کہ کیا حرج ہے، اپنا خوشیا ہی تو ہے آنے دو۔''

کانتا کی معنی خیز مسکراہٹ اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ خوشیا اس کے ایک ایک انگ کا جائزہ لیتا ہے لیکن کانتا رتی بھر نہیں گھبراتی اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں شرم و حیا کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ خوشیا سوچنے لگتا ہے کہ وہ کانتا کا دلال تو ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ اسے ''اپنا خوشیا'' سمجھ کر اس کے سامنے برہنہ کھڑی ہو جائے۔

وہ محسوس کرتا ہے کہ ''اپنا خوشیا ہی تو ہے آنے دو'' میں اس کی تذلیل اور تحقیر چھپی ہوئی ہے۔ گویا اس کے مردانہ وقار کے گلے پر کانتا نے چھری پھیر دی ہے۔ کانتا نے اس کی مردانگی کو للکارا ہے اور اسے بے ضرر آدمی سمجھا

ہے۔اب خوشیا کوایسے معلوم ہونے لگتا ہے کہ گویا کانتا نہیں بلکہ وہ خود برہنہ ہوگیا ہے۔کانتا کے ان الفاظ نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

خوشیا کا انجام بھی موزوں اور قابلِ قبول ہے۔خوشیا اس توہین کا بدلہ کانتا سے کانتا کو حاصل کر کے چکا لیتا ہےاوراس طرح اس کے زخم خوردہ جذبات اوراحساسات کی تسکین ہو جاتی ہے۔

منٹواس افسانے کے ذریعے قاری کو بتانا چاہتے ہیں کہ خوشیا دس سال کے لمبے عرصے سے رنڈیوں کے دلال کے طور پر کام کر رہا ہے۔وہ اپنے پیشے کے اسرار ورموز سے خوب واقف ہے اور رنڈیوں کے شب و روز سے خوب آگاہ ہے لیکن کبھی اس کے ماحول نے اس کے جذبات واحساسات کو منجمد نہیں کیا۔اس کے اندر کا انسان اس کے سینے کی آلائشوں سے زنگ آلود نہیں ہوا۔جب اس کی خودداری پر حرف آتا ہے تو اس کے اندر کا مرد انگڑائی لے کر جاگ اٹھتا ہے۔

''ہتک''اور''خوشیا'' دونوں افسانے اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ ایک بازاری عورت اور رنڈیوں کے ایک دلال کی بھی ہتک ہوسکتی ہےان کے جذبات بھی مجروح ہو سکتے ہیں۔ان کو چوٹ لگےتو وہ بھی دیگر انسانوں کی طرح تلملاتے اور پیچ وتاب بھی کھاتے ہیں اورانھیں تب تک سکون حاصل نہیں ہوتا جب تک وہ اپنی توہین اورتحقیر کا بدلہ نہ چکالیں۔

''جنس'' کے حوالے سے ایک سماجی مسئلہ یہ ہے کہ سماج جس کی مروجہ اقداراوراخلاقی بندشیں فطری جبلتوں اورخواہشوں کے آگے روک لگا دیتی ہیں اورفطری انسان گھٹن اور کج روی کا شکار ہو جاتا ہے۔منٹو کے ہاں اس نا اُمید انسان کے کئی روپ ہیں۔اس کے کردار گناہ اور گندگی میں گھرے نظر آتے ہے مثلاً طوائفیں،ان کے گاہک،طوائفوں کے دلال،عیاش مرد اور بدکار عورتیں۔ یہ سب موجودہ سماج کے گناہ آلود جنسی زندگی کے مارے ہیں،نتیجتاً فطری جبلتوں کو جب بندشوں سے روکا جاتا ہےاوروہ ان بندشوں کوتوڑ کر باہر نکل آتی ہیں تو جنسی زندگی میں افراتفری اور بے راہ روی سی پیدا ہو جاتی ہے۔اخلاقی اور سماجی بندشوں نے انسان کو گناہ سے بچانے کی بجائے گناہ کی پستیوں میں دھکیل دیا ہے۔

منٹو اپنے افسانے ''میرا نام رادھا ہے'' میں راج کشور کا بتاتے ہیں کہ وہ معاشرے میں ایک کامیاب شخصیت ہیں۔ ریاکاری کے صلے میں اسے سوسائٹی نے سر آنکھوں پر جگہ دی ہے۔ وہ ایک ایسا فرشتہ صفت انسان مانا جاتا ہے جس کا دامن بے داغ ہے۔ لیکن اس دامن کو ذرا اٹھا کر دیکھا جائے کہ نیچے کیسی ریاکاری اور گندگی چھپی ہے۔ اس ریاکار باطن کے ساتھ ساتھ اس کے پاس سرد اور بے رحم دل ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی انا پرستی، خود پسندی اور خود نمائی واضح ہے۔ منٹو ہمیں بتانا چاہتے ہیں کہ بعض اوقات جو چیز سماج ہمارے سامنے پیش کرتا ہے یا ظاہری طور پر نظر آتی ہے، اصل میں وہ اس کے بالکل متضاد ہوتی ہیں۔ لیکن ہمارا سماج انسان کو اسی لحاظ سے پرکھتا ہے جیسے وہ اوپر سے نظر آتی ہیں۔ اسے اس چیز سے فرق نہیں پڑتا ہے کہ ان کا باطن کیسا ہے۔ منٹو کو اپنے کردار 'راج کشور' سے جتنی نفرت ہے اتنی ہی محبت انھیں اپنے کردار 'بابو گوپی ناتھ' سے ہے۔ اپنے اس افسانے میں منٹو بتاتے ہیں کہ بابو گوپی ناتھ مروجہ اخلاقی اقدار کی رو سے چھٹا ہوا بدمعاش اور عیاش ہے لیکن اس بدی کے خول میں اس کے پاس ایک نیک باطن ہے۔ اس کی روح پاکیزہ ہے اور دل بڑا ہے۔ اس کے پاس خلوص، دوستی اور ہمدردی کا بے پناہ جذبہ ہے۔ وہ دوسروں کے دھوکے کو پہچاننے کے باوجود بھی ان سے دوستی قائم رکھتا ہے اور ان پر بے دریغ خرچ کرتا ہے کیونکہ بیوقوف بننے اور اپنے آپ کو دھوکا دینے میں اسے لطف آتا ہے۔

بابو گوپی ناتھ خود کہتا ہے: ''رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار یہی دو جگہیں ہیں جہاں میرے دل کو سکون ملتا ہے۔ ان دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر چھت تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے۔ جو آدمی خود کو دھوکا دینا چاہے اس کے لیے اس سے اچھا مقام کیا ہوسکتا ہے؟''

عموماً انسان کو شیطان یا فرشتے کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن منٹو بتاتا ہے کہ انسان میں حیوانیت کی آخری حد تک گر کر بھی انسانی حس باقی رہتی ہے۔ منٹو کو انسان پر اعتماد ہے کہ اس میں گندگی ہے، بدی ہے، اور بدصورتی ہے لیکن فطری انسان پھر بھی اندر سے خوبصورت ہے۔

منٹو نے اپنے افسانے ''نعرہ'' میں ایک اور سماجی مسئلہ پیش کیا ہے جس میں انھوں نے امیر کے تکبر اور نخوت اور غریب کی بے بسی، بے کسی اور بیچارگی کا نقشہ کھینچا ہے اور قاری کے ذہن پر اس کا تاثر چھوڑا ہے۔

نعرہ ایک ترقی پسند افسانہ ہے جس کا کردار کیشو لال ایک غریب مونگ پھلی بیچنے والا ہے جو ایک سیٹھ کی بلڈنگ میں دس روپے ماہوار کی کھولی میں کئی سال سے رہتا آرہا ہے۔ بیوی کے بیمار ہونے کی وجہ سے وہ اس بار کرایہ ادا نہیں کر پاتا تو سیٹھ اسے اپنے پاس بلاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر وہ اپنا غم سنائے گا تو سیٹھ کا دل پسیج جائے گا لیکن جواب میں سیٹھ اسے گالیاں دیتا ہے۔ کیشو لال آگے سے خاموش رہتا ہے کیونکہ وہ اپنا غرور پیچھے ہی چھوڑ آیا تھا۔

منٹو نے اس کہانی میں 'تکرار' اور 'تضاد' سے کام لیا ہے۔ دو گالیوں کی تکرار سے کیشو لال کے مجروح جذبات بری طرح بھڑک اٹھتے ہیں۔ غم و غصے سے اس کا دماغی توازن ہل جاتا ہے اور اسے تب تک چین نہیں آتا جب تک کہ وہ ایک نعرہ لگا کر اپنے اندر کا زہر باہر نہیں نکال دیتا۔ تضاد سے غریبی اور امیری کا تفاوت نمایاں ہوتا ہے۔ اس سے منٹو بتانا چاہتے ہیں کہ کس طرح ہمارے سماج میں صرف اسی کی عزت ہوتی ہے جس کے پاس پیسے ہوتے ہیں اور سمجھا جاتا ہے کہ اس کے پاس ہر کام کرنے کی طاقت ہے۔ وہ کسی کی عزت بھی مجروح کر سکتا ہے۔ اس کے پاس پیسہ ہے لہٰذا اسے کوئی پلٹ کر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ پیسے کی طاقت سے ہر کام کروا سکتا ہے۔

اس افسانے میں بھی امیری اور غریبی کا یہی تضاد نظر آتا ہے۔ کیشو لال جو اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا وہ آخر سیٹھ کی گالی سن کر خاموشی اختیار کیے رکھتا ہے۔ آخر ایسی کیا چیز ہے جو اسے بولنے سے روک رہی ہے، یہ دراصل امیر اور غریب کا تضاد ہے۔ کیونکہ کیشو لال غریب ہے اس لیے وہ اسے کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سیٹھ اسے گالی دے دے کیونکہ وہ غریب ہے۔ کیا غریبوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی؟ ہم یہ تضاد مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھ سکتے ہیں:

> وہ اپنا دیا بجھا کر اور اپنے آپ کو اندھیرے میں لپیٹ کر مالک مکان کے اس روشن کمرے میں داخل ہوا، جہاں وہ اپنی دو بلڈنگوں کا کرایہ وصول کرتا تھا اور ہاتھ جوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ سیٹھ کے تلک لگے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

غرض نعرہ کی اساس دو گالیوں کی تکرار پر قائم ہے اور اس کے علاوہ غریبی اور امیری کا تضاد، کیشو لال اور سیٹھ کا تضاد کھل کر نمایاں ہو جاتا ہے۔ منٹو نے اپنے اس افسانے میں مفلسوں کی زبوں حالی سے پیدا ہونے والی ذہنی اور

جذباتی حقیقت کی تصویر قاری کے سامنے پیش کی ہے اور اس بے بسی کو پیش کر کے اس نظام میں موجود تضاد کو واضح کیا ہے۔ انقلاب کا خیال بھی کہیں کہیں اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ اور آخر میں ان سب باتوں کی تان ایک احساسِ شکست ہی پر جا کر ٹوٹتی ہے۔

''شغل'' ایک اور ترقی پسند افسانہ ہے جس میں چند مزدور صبح سے شام تک چند روپیوں کی خاطر پہاڑوں پر سے پتھر اٹھاتے ہیں اور سڑکیں صاف کرتے ہیں۔ اگر وہ کام میں ذرا سی بھی کوتاہی کریں تو انھیں چشم زدن میں نوکری سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ منٹو بتاتے ہیں کہ جب وہ مزدور سڑک پر کشمیر کو جاتی اور کشمیر سے آتی لاریوں کی آمد و رفت دیکھتے ہیں تو لاریوں کی شاندار اسباب سے لدی ہوئی چھتیں اور ان کی کھڑکیوں سے مسافروں کے لہراتے ہوئے ریشمی کپڑوں کی جھلک مزدوروں کے دلوں میں ایک ناقابلِ بیان تلخی پیدا کرتی ہے اور انھیں شدت سے اپنی محرومیوں اور نامرادیوں کا احساس ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ان پتھروں کی طرح ناکارہ اور فضول سمجھنے لگتے ہیں جنھیں وہ سارا دن اِدھر سے اُدھر پھینکتے رہتے ہیں۔

لیکن ایک دن جب دو نوجوان آتے ہیں اور سنتو جمار کی لڑکی کو موٹر پر بٹھا کر لے جاتے ہیں تو مزدور یہ دیکھ کر پیچ و تاب کھانے لگتے ہیں اور پنڈت سے بات کرتے ہیں۔ پنڈت کہتا ہے:

> میں نے ان سے دریافت کیا ہے، کوئی بات نہیں، وہ لڑکی کو ذرا موٹر کی سیر کرانا چاہتے تھے۔ انسپکٹر صاحب کے مہمان ہیں اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دور لے جا کر اسے چھوڑ دیں گے! امیر آدمی ہیں۔ ان کے شغل اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

ان میں سے ایک مزدور یہ سن کر کہتا ہے:

> اگر امیر آدمیوں کے یہی شغل ہیں تو ہم غریبوں کی بہو بیٹیوں کا اللہ بیلی ہے۔

منٹو نے ہمارے سامنے یہ سماجی مسئلہ پیش کیا اور معاشرے کے ایک گھناؤنے پہلو سے پردہ ہٹایا ہے۔ یہ افسانہ ہمارے معاشرے کی ناہمواری اور عدم توازن کی عکاسی کرتا ہے اور اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ منٹو کے دل میں سماج کے پامال طبقے کے لیے ہمدردی کا جذبہ موجزن ہے اور وہ موجودہ نظام کی افراط و تفریط کی شدت سے

مخالفت کرتے ہیں۔ یہ افسانہ تعیش پسندی کے بارے میں بتاتا ہے کہ کس طرح ہمارے معاشرے کے امیر لوگ اس برائی میں مبتلا ہو چکے ہیں اور ان کے لیے سب کچھ برائی نہیں ہے بلکہ شغل ہے۔ جب کہ دوسری طرف کسی کی عزت برباد ہو رہی ہے لیکن انھیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ امیر اور غریب کا اتنا فرق ہے کہ غریب یہ سب کچھ ہوتا دیکھنے کے باوجود بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اندر ہی اندر یہ غم اسے کھائے جاتا ہے لیکن وہ صدائے احتجاج بلند کرنے سے قاصر ہے۔ ان کا من روتا ہے لیکن لب نہیں ہل سکتے کہ انھیں اپنی بے بسی اور بے کسی کا شدید احساس ہے۔

منٹو کا ایک اور افسانہ ’’فرشتہ‘‘ محض نیا افسانوی تجربہ نہیں بلکہ معاشرت اور ذہن کی بعض منحرف قوتوں کی کتھا بھی ہے جسے منٹو نے سماجی آگہی کے ساتھ پیش کیا۔ اس کہانی میں بدلتی ہوئی اقدار اور کج روش کردار بالآخر علاماتِ انتشار بن جاتے ہیں۔

اس میں غربت اور بیماری سے پیدا ہونے والی مشکلات دکھائی گئی ہیں کہ انسان بھوک مٹانے کے لیے اپنی عزت تک قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور معاشرے کے وہ لوگ جو انسان کی جان بچانے کے لیے ہیں وہ خود انسان کو مار دیتے ہیں۔

غرض منٹو کے اور بھی بہت سے افسانے پڑھ کر قاری کو پتہ چلتا ہے کہ سماج کی نظروں میں عام طور پر انسان کے دو ہی روپ ہوتے ہیں سیاہ اور سفید۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کی پراسرار شخصیت کئی رنگوں سے مل کر بنتی ہے۔ کوئی انسان نہ یکسر بدخصلت ہو سکتا ہے اور نہ سراسر نیک سیرت۔ کسی فردِ واحد کے باطن کے بحرِ بے پایاں میں غوطہ زن ہونا سماج کے بس کی بات نہیں۔ سماج سطحی طور پر دیکھتا ہے اور اپنا فتویٰ جاری کر دیتا ہے کہ فلاں شخص اچھا ہے اور فلاں شخص برا ہے۔ سماج انسانوں پر محض ایک سرسری نظر ڈالتا ہے اور اسے اتنی فرصت نہیں کہ وہ کسی شخص کے باطن کے نہاں خانوں میں جھانک کر دیکھ سکے کیونکہ سماج بصارت ضرور رکھتا ہے لیکن بصیرت نہیں۔ اس کی نگاہ دوررس اور باریک بین نہیں۔

منٹو اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ انسان جتنا باہر جیتا ہے اس سے کئی گُنا زیادہ اندر جیتا ہے اور اصلی اور حقیقی انسان وہ ہوتا ہے جو ہمارے اندر بستا ہے۔ نہ کہ وہ جو ہمیں ظاہری طور پر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن منٹو کی دوررس،

باریک بین، اور عقاب صفت نگاہیں انسان کی تہ در تہ شخصیت کی پرتیں اتارتی چلی جاتی ہیں۔ حتیٰ کی انسان کی اصلی اور حقیقی تصویر اپنی تمام اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ قاری کے سامنے نمایاں ہو جاتی ہے۔ منٹو قاری کو سفید اور سیاہ میں فرق واضح کر کے دیتے ہیں۔ منٹو نے معاشرے کی بدی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور زندگی کے اِن پہلوؤں کو بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ منٹو ایک عظیم افسانہ نگار ہیں۔

(یسریٰ جمیل لمز کی طالبہ ہیں)

عبدالوہاب نیاز

محسن نقوی: ''بجھ کر بھی نشانِ رہِ منزل تو رہوں گا''

ہر فن کار کا فن اُس کی شخصیت کا حصہ اور پہچان کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اُس کے فن پارے محض اس کی شخصیت کو ہی ظاہر نہیں کرتے بلکہ معاشرے کے مختلف پہلوؤں کا عکس بھی ہوتے ہیں۔ لیکن جب ہر شخص معاشرے کے پہلوؤں کو اپنی نگاہ سے پرکھے تو افراد کے مابین اختلاف کا امکان بڑھ جاتا ہے اور اگر اختلاف ایک خاص حد سے تجاوز کر جائے تو بعض اوقات دشمن کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اِسی طرح تنقید و تعمیر بھی ہر فن کار کی کاوشوں کا حصہ ہوتی ہے۔ محسن نقویؔ کا شمار اردو کے قد آور شعرا میں ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری کے نقاد اور قدر دان دونوں ہی بڑی تعداد میں موجود رہے ہیں۔

محسن نے اپنی سوچ اور شعری صلاحیت کے امتزاج سے ادب میں ایک منفرد جگہ پائی ہے۔ اس نے شاعری کی تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ محسن نے غزل، نظم، آزاد نظم، حمد، نعت، نوحہ، مرثیہ، غرض ہر صنف میں اپنے منفرد انداز کے ذریعے اپنا لوہا منوایا ہے۔

محسن کی شاعری میں جرأت، محبت، ایثار، قربانی کے ساتھ ساتھ احتجاج اور تڑپ بھی ملتی ہے۔ وہ اپنے اندر متحرک سوچ اور نرمی کا پیغام سموئے ہوئے ہے۔ وہ جگہ جگہ غم میں خوشی، تنہائی میں انجمن، اندھیرے میں روشنی، ناکامی میں کامیابی، شکست میں فتح اور غلامی میں سرداری تلاش کرتا نظر آتا ہے۔ وہ کہیں پل بھر کو مایوس نظر آتا ہے تو دوسرے ہی لمحے ایک بلند حوصلے کے ساتھ کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اِس قسم کے متحرک جذبات کو وہ اِس انداز میں شعری جمال میں سمیٹتا ہے کہ قاری کے لیے پُر اثر پیغام اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔

اس حوالے سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جہاں لہو کے سمندر کی حد ٹھہرتی ہے
وہیں جزیرۂ لعل و گہر بھی آتا ہے
چلے جو ذکر فرشتوں کی پارسائی کا
تو زیرِ بحث مقامِ بشر بھی آتا ہے

اے تیز ہوا میرا دھواں دیکھ کے جانا
بجھ کر بھی نشانِ رہِ منزل تو رہوں گا
محسن زدِ اعدا سے اگر مَر بھی گیا میں
معیارِ تمیزِ حق و باطل تو رہوں گا

نوکِ نیزہ پہ جو سج کر نکلا
کسی خوددار کا سر لگتا ہے
جو بھرے شہر سے شب کو نکلا
وہ کوئی اہل خبر لگتا ہے

محسن نے جگہ جگہ مبالغہ آرائی کا استعمال کر کے معنی اور مطلب کی وضاحت کی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں سادہ اور سلیس مرکبات کا اِس انداز سے استعمال کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے کہ شعر میں خوبصورتی، پیغام میں شدت اور تاثیر میں عمدگی واضح ہو جاتی ہے۔ محسن نقوی نے اپنے اشعار میں صحرا، سمندر، اجاڑ پن اور مقتل کو تشبیہ واستعارے کے طور پر جگہ جگہ خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار میں نوکِ نیزہ پہ سج کر نکلنا اور بھرے شہر میں شب کو نکلنا بظاہر سادہ اور سلیس دکھائی دیتے ہیں لیکن یہ ترکیبات اپنے ساتھ ایک خاص معنویت رکھتی ہیں اور شعر میں تاثیر اور خوبصورتی کا بھی باعث بنتی ہیں۔ اِسی طرح پہلے دو اشعار میں ''لہو کے سمندر'' اور ''جزیرۂ لعل و گہر'' خوبصورتی اور مبالغہ آرائی کے ذریعے سوچ کو واضح کرتے ہوئے پیغام کی شدت کا اظہار کر رہے ہیں۔ دوسری طرف ہوا سے کلام

کرتے ہوئے محسن خود ایک روشنی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ اِس قسم کا طرزِ بیان فنِ شاعری میں محسن نقویؔ کا حسنِ کمال ظاہر کرتا ہے۔

محسن نقویؔ نے تشبیہ واستعارے کے طور پر استعمال کی جانے والی عام اصطلاحات کو ایک منفرد انداز میں استعمال کیا اور اپنی فکر اور تخیل کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالا۔ اِس کے ذریعے وہ معاشرے کی سوچ کو متحرک رکھنے کی سعی کرتا ہے۔ وہ اصولوں کی خاطر ہر طرح کی قربانی کی تلقین کرتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ قاری کو بار بار جھنجھوڑتا اور حرکت پیدا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اپنی شاعری میں وہ خاموش بیٹھنے کی بجائے متحرک نظر آتا ہے۔ محسن کے ہاں کامیابی قربانی میں پنہاں ہے۔

رفعتِ دار و عروجِ بام کو
دوستو نوکِ سناں پر سوچنا
خشک پتّوں کی طرح محسن کبھی
تم بھی صحرا میں بکھر کر سوچنا

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محسن ظاہری تنگی اور الجھنوں کی بجائے ان کے ذریعے سے حاصل ہونے والے مقام اور منزل کی طرف متوجہ ہے۔ اسی سوچ کا ایک اور پہلو محسن ہی کی ایک غزل میں مشکل حالات میں امید وسعیِ پیہم کے درس کی صورت دکھائی دیتا ہے۔

جب تک میں بغاوت نہ کروں جبر و ستم سے
زنداں میں ہوں پابندِ سلاسل تو رہوں گا

محسن نے اپنی فنی مہارت سے سب کو حیران کر دیا تھا۔ کہیں کہیں وہ دیگر شعرا سے متاثر بھی نظر آتا ہے۔ افکار اور زاویۂ نگاہ میں تو مماثلت دکھائی دیتی ہے لیکن محسن کا اپنا منفرد اسلوب ان تاثرات کو اِس طرح ڈھانپ لیتا ہے کہ کہیں بھی متاثر ہونے کا شائبہ تک نہیں رہتا بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سوچ اور فکر صرف محسن نقوی کے ہاں ہی پائی جاتی ہے۔

محسن اپنی شاعری میں جگہ جگہ جمود کے خلاف لڑتا بھی دکھائی دیتا ہے:

کبھی سورج سوا نیزے پہ اُترے
یہ کیسی حرف کی چادر تنی ہے؟

میں جاں بہ لب تھا پھر بھی اصولوں پہ اڑ گیا
بجھتا ہوا چراغ ہواؤں سے لڑ گیا

میں نے قدم بڑھائے جو صحرا کی دھوپ میں
گھبرا کے میرا سایہ مرے پاؤں پڑ گیا

محسن کے ہاں جدوجہد ہی زندگی ہے۔ وہ حق کے لیے باطل سے ٹکرا جانے کا درس دیتا ہے اور بجھی ہوئی راکھ سے بھی حق کی طرف رہنمائی کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ خودی پر پختہ اعتماد اور جبر کے خلاف ہر ممکن جدوجہد کا پیغام دیتا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ وہ تلقین کرتا ہے کہ اپنی فکر کو آزاد اور جذبوں کو جواں رکھو، حق کے لیے نکلو اور اپنی سوچ اور جنون کو کسی باطل قوت کی ترویج اور فروغ کے لیے استعمال نہ ہونے دو۔ اس کے پیغام کا ماحصل یہ ہے کہ اپنی سوچ کو کسی باطل قوت کے تابع نہ ہونے دو۔ اسی حوالے سے محسن کے کچھ اشعار دیکھیے:

بنامِ طاقت کوئی اشارہ نہیں چلے گا
اُداس نسلوں پہ اب اجارہ نہیں چلے گا
ہم اپنی دھرتی سے ہر سمت خود تلاشیں
ہماری خاطر کوئی ستارہ نہیں چلے گا
چلو سروں کا خراج نوکِ سناں کو بخشیں!
کہ جاں بچانے کا استخارہ نہیں چلے گا
ہمارے جذبے بغاوتوں کو تراشتے ہیں
ہمارے جذبوں پہ بس تمھارا نہیں چلے گا
ازل سے قائم ہیں دونوں اپنی ضدوں پہ محسنؔ
چلے گا پانی مگر کنارہ نہیں چلے گا

محسن، اقبالؒ کے افکار سے بھی متاثر دکھائی دیتا ہے۔اقبال سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ محسن نے اپنی ایک نظم ''ازل سے دست بریدہ اٹھائے پھرتا ہوں'' اقبال کے حضور نذر کی۔ اِس نظم میں محسن، اقبال سے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر شرمندہ نظر آتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ جن افکار کا درس اقبال نے دیا اور جو خواب اُس 'مصورِوطن' نے دیکھے، اُن کی تعبیر اور نتیجہ موجودہ دور میں کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ وہ کہتا ہے کہ نئی روایات نے اقبال کے دیے گئے درس کی جگہ اِس طرح سے ہی لے لی ہے کہ اب ہم اپنی ہی روایات اور خودی سے نا آشنا ہیں۔ اب ہم میں وہ جذبہ اور شعور نہیں رہا جس کی تعلیم اقبالؒ نے اپنی شاعری اور فلسفے کے ذریعے دی ہے۔ اِس حالتِ زار پر وہ انفرادی طور پر خود کو اِس لیے شرمندہ پا رہا ہے کہ وہ فکرِ اقبال کے فروغ کی سعی میں وہ اقبال کی سی صدا بلند نہ کر سکا۔ ایک ایسی صدا جو اس قوم کو موجودہ پستی سے نکال کر اقبالؒ کی بتائی ہوئی منزل تک پہنچا دے۔

وہ محسوس کرتا ہے کہ ہم راہِ راست سے بھٹک گئے ہیں۔ جو راہ اقبالؒ نے ہمیں دکھائی تھی ہم اُس کو بھول کر نئی روایات کی طرف مائل ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں موجودہ پس ماندہ حالات کا سامنا ہے۔ اِن حالات کی حقیقت جاننے کے باوجود بھی وہ مایوس نہیں دکھائی دے رہا۔ وہ اُداس ضرور ہے اور شرمندگی کا اظہار بھی کر رہا ہے لیکن پر اُمید ہے کہ ہم درست سمت میں ضرور چلیں گے اور اپنی منزل کو آخر پا ہی لیں گے۔ نہ صرف یہ کہ محسن پر امید ہے بلکہ اِس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی بصیرت سے اِس پستی سے نکلنے کا حل بھی پیش کرتا ہے۔

مثال کے طور پر اقبال کی نذر کی جانے والی نظم کے چند اشعار دیکھیے:

بہت کہوں بھی کہ زندہ ہے دِل مگر اس میں
شعورِ درد و مذاقِ خودی رہا بھی نہیں
تری نگاہ تو سورج کی سجدہ گاہ بنی
میری نگاہ مگر خود سے آشنا بھی نہیں

صدائے کن فیکوں ہو کہ ضربِ اِلاّ اللہ
وہ نیند ہے کہ کوئی ذہن جاگتا بھی نہیں

اِسی نظم میں آگے انفرادی طور پر شرمندگی کا اظہار کر رہا ہے:

میرے وطن کے مصور میں تجھ سے نادم ہوں
ترے شعور کے خاکے گنوا دیے میں نے
مرے لبوں پہ سجایا تھا جن کو تو نے کبھی
وہ گونجتے ہوئے نغمے بھُلا دیے میں نے

اُداسی اور شرمندگی کا اظہار کرنے کے بعد آخر میں وہ اُمید کی روشنی کے ذریعے علاج کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

اگر ہے روح سفر میں ازل سے تا بہ اَبد
تو جسم گردِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں
مجھے دُعا کا سلیقہ نہ آ سکا اب تک
کہ میں ہلاکِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں
میں جاں بلب ہوں مگر اے مرے مسیح نفس!
''مرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں''

محسن نقوی کے دشمن یا مخالفین بھی بہت تھے اور دوست بھی بکثرت پائے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بھی اس بات کا احساس تھا۔ وہ اپنی شاعری میں بھی دونوں طرح کے لوگوں سے خطاب کرتے اور جواب دیتے دکھائی دیتے ہیں، وہ دراصل لوگوں کے اِس قسم کے رویوں کو اپنا اثاثہ تصور کرتے تھے۔ اور فنِ شاعری میں ہنر اور فکر کے باکمال اور منفرد امتزاج کے ذریعے ایک امتیازی حیثیت حاصل کرنے کے باوجود وہ اپنے چاہنے والوں کی قدر کرتے اور ناقدین سے سیکھنے کے عمل میں عجز و انکساری کے ساتھ پیش آتے۔ اسی سلسلے میں وہ کہتے ہیں،

میں کہ اِس شہر کا سیماب صفت شاعر ہوں
میں نے اس شہر کی چاہت سے شرف پایا ہے
میرے اعدا کا عذاب ابرِ کرم ہے مجھ کو
میرے احباب کی نفرت مرا سرمایہ ہے

وہ سخن کی دنیا میں اپنی کاوش سے مطمئن نظر آتا ہے اور کہتا ہے کہ:

مطمئن ہوں کہ مجھے یاد رکھے گی دنیا!
جب بھی اِس شہر کی تاریخِ وفا لکھے گی
میرے گھر کے در و دیوار مجھے سوچیں گے
وسعتِ دشت مجھے آبلہ پا لکھے گی
میرا ماتم اسی چپ چاپ فضا میں ہو گا
میرا نوحہ انھی گلیوں کی ہوا لکھے گی

(عبدالوہاب نیازلمز کے طالب علم ہیں)

آئمہ افضل

منٹو کے دو کرداروں ''سلطانہ'' اور ''سوگندھی'' کا موازنہ

سعادت حسن منٹو کا اُردو ادب میں بڑا کمال یہ رہا ہے کہ انھوں نے روایتی موضوعات پر لکھنے کی بجائے معاشرے کے رد کیے ہوئے کرداروں کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ منٹو کی فنی خصوصیت محض ان رَد کیے ہوئے کرداروں کو موضوع بنانے تک ہی محدود نہیں بلکہ ان کا بطور انسان تجزیہ پیش کرنے میں پوشیدہ ہے۔ منٹو نے معاشرے میں عرصے سے مروج تصورات سے علی الاعلان بغاوت کی اور انھیں تلخ انداز میں قلم بند کیا۔ ان کرداروں کی تنہائی اور یہ کس طرح سے ان کے جذبات و کیفیات اور رویے کو متاثر کرتی ہے، اس کا خاص ذکر ہمیں منٹو کے ہاں ملتا ہے۔

منٹو کی افسانوی دنیا کی ہیروئن کوئی مٹیار، دولت منداور شہرت یافتہ خوبصورت دوشیزہ نہیں بلکہ ایک ٹھکرائی ہوئی 'طوائف' ہے۔ اگر 'طوائف' کے لفظ کو عمومی نظر سے دیکھا جائے تو بلا شبہ اس پیشے سے منسوب ہر عورت انسانیت کے درجے سے گری ہوئی ایک بے شرم، بے حیا اور بری عورت معلوم ہوتی ہے۔ معاشرتی تربیت کے نتیجے میں بننے والی یہ تصویر طوائف کو ایک عورت تو کیا انسان سمجھنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ حال آنکہ اگر انسان خود کو اس روایتی سوچ کی زنجیروں سے آزاد کر کے دیکھے تو طوائف ایک عام عورت سے کہیں زیادہ بہادر ہے، جیسا کہ منٹو کی سلطانہ اور سوگندھی ہیں۔ اگر چہ یہ دو مختلف کردار ہیں لیکن ایک ہی طبقے کی عکاسی کرتی ہیں۔

سلطانہ اور سوگندھی دونوں مکمل اکیلے پن کا شکار ہیں۔ وجود کی اس تنہائی نے انھیں اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔ زندگی میں سچے، مخلص رشتوں کی پیاس نے انھیں احساس محرومی سے نڈھال کر دیا ہے۔ منٹو نے اپنے افسانوں

میں طوائفوں کو بطور آلہ کار شامل نہیں کیا بلکہ انھیں انسانیت کا درجہ دے کر ان کے رویے کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ سلطانہ اور سوگندھی ہیں تو مخصوص کردار لیکن ساتھ ہی وہ ہر عورت کے جذبات واحساسات کی عکاس ہیں۔ 'سلطانہ' اور 'سوگندھی' نام کے خول کے نیچے ایک عام عورت ہے جو توجہ چاہتی ہے، محبت کی طلب گار ہے اور ایک نارمل زندگی کی خواستگار ہے جس میں خاندان ہو، دوست احباب اور رشتے دار ہوں جو اس کی تنہائی کو بانٹ سکیں۔

سچی محبت کی پیاس نے جہاں ایک طرف سوگندھی کو جھوٹے مادھو پر یقین کرنے پر مجبور کیا وہیں دوسری طرف سلطانہ کی اس تنہا زندگی نے اُسے شنکر جیسے تیز انسان کی طرف مائل کر دیا۔ یہ سب جانتے ہوئے کہ پیار کے یہ سب دعوے اور وعدے جھوٹے ہیں یہ دونوں اپنی روح کی تشنگی کو دور کرنے اور محض چند لمحوں کی خوشی کے لیے خود کو دھوکا دیتیں اور اس پر یقین کرنے کو آمادہ ہو جاتیں۔

دونوں کردار فطرتاً حساس معلوم ہوتے ہیں۔ سوگندھی نے اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی تکلیف کو نظر انداز کرتے ہوئے محض ہمسائی کی مدد کے لیے ایک رات بڑے صاحب کے ساتھ گذارنے پر آمادگی کا اظہار کیا، اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے ایک دوسری عورت کی مدد کے لیے اپنی جسمانی تذلیل کا انتخاب کیا۔

منٹو نے طوائف کے ساتھ ایک رد کی ہوئی چیز کی طرح برتاؤ کرنے کی بجائے سوگندھی اور سلطانہ کے رویوں کو عام انسانیت کے زاویے سے دیکھا ہے۔ یہ کس طرح کی خواہش مند ہیں، جو اندرونی طور پر محروم ہیں اور محبت کی ترسی ہوئی ہیں۔ آسان نہیں ہے ہر روز خود کی تذلیل برداشت کرنا، ہر شب اپنا جسم کسی اجنبی کے حوالے کرنا۔ جسمانی ذلت کو گلے لگانا سہل نہیں ہوتا۔ بہت سے جذبات، احساسات کو بھینٹ چڑھانا پڑتا ہے، بہت سی خواہشات کو رد کرنا پڑتا ہے، اپنے وقار، عزت اور حرمت سب کی قربانی دینا پڑتی ہے۔

سوگندھی کے لیے یہ پیشہ زیادہ تکلیف دہ نظر آتا ہے کیونکہ افسانے میں اس کا ماضی نارمل ہونے کے شواہد ملتے ہیں۔ کس قدر مشکل ہے ایک نارمل، ہنستی بستی، خالص رشتوں سے بھرپور زندگی سے ٹھوکر کھا کر ایسے مقام پر آ کھڑے ہونا جہاں محض اپنی عزتِ نفس اور خواہشات کا ٹھکرائے جانا تقدیر میں لکھا ہو۔

سلطانہ کی زندگی میں بنیادی تبدیلی ایک امیر طوائف سے غریب طوائف بننے کا عمل ہے۔ انبالہ میں بیس تیس

روپے کمانے والی جب تین روپے کی آمدن پر آجائے تو محرومی کا عالم اور بڑھ جاتا ہے کہ انسان اپنے جسمانی اور روحانی وقار کو داؤ پر لگا کر بھی اتنے پیسے حاصل نہ کر سکے کہ پیٹ بھر کر کھانا کھا سکے اور اپنی جسمانی ضروریات کو پورا کر سکے۔ یہ محرومی سلطانہ کو وجود کی اصل تنہائی کے کمال تک پہنچا دیتی ہے۔ زندگی کے حالات نے سلطانہ کو ریل کے ڈبے کی طرح خالی کر دیا تھا۔ اس کی وجودی تنہائی اسے دنیا سے ڈراتی ہے اس تنہائی کے خلا کو پر کرنے کے لیے کوئی اس کی روح سے تعلق قائم نہیں کرتا۔

دونوں طوائفوں کی زندگی میں ہمیں استحصال نظر آتا ہے۔ سوگندھی کی مادھو کے ہاتھوں اور سلطانہ کی خدا بخش اور پھر شنکر کے ہاتھوں جب وہ خود کو بہلانے کے لیے ان کی جھوٹی محبتوں کے جال میں پھنس جاتی ہیں۔ یہی المیہ منٹو نے سوگندھی اور سلطانہ کے کرداروں کے ذریعے اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔

دونوں ہی کردار اپنی حیثیت سے بخوبی آگاہ ہیں کیونکہ یہ دو معاشرے کے وہ کردار ہیں جو بغیر کسی ذاتی قصور کے اس پیشے کی ذلالت سہہ رہے ہیں۔ ظالم مردوں کی ہوس اور معاشرے کی بے حسی انھیں ایسے مقام تک لے آتی ہے جہاں سے واپسی کا ہر دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ عزتِ نفس کی پامالی کی انھیں اس قدر عادت ہو جاتی ہے کہ یہ دونوں ہی خوابوں کی دنیا کے سہارے سانس لینے لگتی ہیں۔ ان کی مدھم سی خوشی کا وسیلہ فریبی مرد بن جاتا ہے جو محض محبت کے جھوٹے دعوے کرتا ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس حقیقت سے آشنا ہوتے ہوئے بھی یہ محض چند لمحے اس دھوکے میں رہنے کو ترجیح دیتی ہیں۔

ذلت کی زندگی کی اس قدر عادی ہو جاتی ہیں کہ یہ بات ان کے لیے غیر معمولی نہیں رہتی اور تذلیل کا احساس ان کے اندر دب کر رہ جاتا ہے لیکن اس کے باوجود سوگندھی ہمیں سخت ہتک کا سامنا کرتے دکھائی دیتی ہے۔ یہ دو واقعات تھے جو ان کرداروں کو ان کی عام زندگی جس کو جھوٹ، ذلت اور دھوکے کے بادلوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، نکال کر حقیقت میں لے آتے ہیں۔

اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سوگندھی اور سلطانہ میں ایک عام انسان کی طرح احساس، محبت، توجہ، تذلیل، حقارت، انسیت جیسے جذبات دبائے تو جا سکتے ہیں لیکن ان کی شخصیات سے خارج نہیں کیے جا سکتے۔ وہ عام

انسان کی طرح ایک نارمل زندگی کی خواہش رکھتی ہیں جہاں کوئی ان کا ہاتھ تھامنے والا، ان کی ذمہ داری لے، سہارا دے، اور اس کی محبت سے ان میں خود اعتمادی پیدا ہو۔ ایک عام عورت ہر وقت پیشہ ور دھندا کرنے والی طوائف پر فوقیت لینا چاہتی ہے۔ اور دوسری طرف، وہ چاہتی ہے کہ کوئی تو ہو جو محبت کے ان جھوٹے وعدوں کو سچا کر دے، جوان کی ذلت، حقارت اور نفرت کی اس زندگی سے جہاں وہ ہر رات خود کو اپنی نظروں میں گراتی ہیں، اپنی خواہشات کو رد کرتی ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی اجنبی مرد کے لیے خوشی کا سامان مہیا کرتی ہیں، کو روشن کر دے۔

معاشرہ صرف سوگندھی اور سلطانہ کو الگ کرنا جانتا ہے، اس میں اتنا ظرف نہیں کہ انھیں عام انسان سمجھتے ہوئے ایک نارمل زندگی کی طرف مائل کرے اور ایسی دلدل سے نکالے جس کا انتخاب اُن کا اپنا نہیں۔

معاشرے کے ان رد کیے ہوئے کرداروں کو منظرِ عام پر لانے کی وجہ سے منٹو کو بہت تنقید کا نشانہ بنایا گیا لیکن منٹو نے کہا مسئلہ میری تحریروں میں نہیں بلکہ اس نظام میں ہے جو سوگندھی اور سلطانہ جیسے کرداروں کو پیدا کر رہا ہے۔ اگر سوگندھی اور سلطانہ عام زندگی میں کسی مرد کے لیے محض ہوس کا نشانہ بنائے جانے والا کھلونا نہیں بلکہ عام عورتیں ہوں جنھیں مرد اپنی عزت بنائے، انھیں ٹھکرا کر اکیلا کرنے کی بجائے انھیں خاندانی زندگی میں لا کر ان کے احساس محرومی کو ختم کرنے کی کوشش کرے، ان کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو پورا کر کے ان کے اندر خود اعتمادی کے جذبے کو پروان چڑھائیں تا کہ وہ بھرپور زندگی کی طرف پیش قدمی کر سکیں تو ایسے کردار معاشرے میں جنم ہی نہ لیں۔

اگر چہ سوگندھی اور سلطانہ مختلف درجوں کی طوائفیں تھیں لیکن اس کے باوجود ان کے اندر دھڑکنے والا دل ایک جیسے جذبات و خواہشات سے بھرپور تھا۔ ان کا احساس تنہائی و محرومی یکساں تھا۔ ان کی زندگی ادھوری اور نامکمل تھی۔ اس ادھوری زندگی کو مایوسی اور تاریکی کے بادلوں نے مزید تنگ کر رکھا تھا جہاں امید، خوشی اور محبت کی کوئی ہلکی سی کرن بھی متوقع نہیں۔ یہ کردار معاشرتی نظام کے پیدا کردہ ہیں اور معاشرہ اگر اپنا ظرف بڑھائے تو انھیں انسانیت کے درجے پر واپس لا سکتا ہے۔

(آئمہ افضل لمز کی طالبہ ہیں)

زینب خواجہ

پیاری کٹی: این فرینک (Anne Frank) کی ڈائری کے چند اوراق

[این فرینک (Anne Frank) ایک جرمن یہودی لڑکی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں اڈوولف ہٹلر کے یہودی مخالف ہتھکنڈوں سے بچ کر اس کا خاندان ہالینڈ ہجرت کر گیا لیکن کچھ عرصے بعد جرمن فوجوں نے ہالینڈ پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہاں بھی یہودیوں کو نگران کیمپوں (concentration camps) میں منتقل کر کے ان پر ظلم و ستم کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ نگران کیمپ سے بچنے کے لیے این فرینک کے خاندان نے کچھ اور لوگوں کے ساتھ ایمسٹرڈیم کے گھر کے ایک خفیہ خانے (secret annexe) میں پناہ لی اور تقریباً تین سال کے عرصے تک وہاں مقیم رہنے کے بعد جنگ کے آخری دنوں میں این فرینک اور اس کا خاندان وہاں سے گرفتار کر کے نگران کیمپ میں منتقل کر دیا گیا۔ اس خاندان میں سے صرف این فرینک کا والد اوٹو فرینک (Otto Frank) بچ کر واپس آسکا۔ این فرینک غیر معمولی طور پر ذہین اور حساس لڑکی تھی۔ وہ اس رُوپوشی کے دور کے واقعات اور اُن سے متعلق اپنے احساسات اپنی ڈائری میں درج کرتی رہی۔ ہٹلر کی شکست اور اتحادیوں کی فتح کے بعد این فرینک کے والد کو اُس گھر سے جہاں انھوں نے پناہ لی تھی یہ ڈائری ملی۔ اس کو بعد میں کتابی شکل میں شائع کیا گیا اور یہ ایک مُدت تک سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں شامل رہی۔ اس پر ہالی ووڈ اور دیگر مُلکوں میں فلمیں بھی بنیں۔ یہاں اس ڈائری کے ایک مختصر حصے کا اُردو ترجمہ شامل کیا جا رہا ہے جسے لمز کی ایک سینئر طالبہ زینب خواجہ نے ترجمہ کیا ہے۔]

(۱)

بدھ،۲۹مارچ،۱۹۴۴ء

پیاری کٹی،

مِسٹر بولکسٹین (Mr. Bolkestein) لندن سے ڈچ نیوز پر بول رہے تھےاوراُنھوں نے اعلان کیا کہ جنگ کے بارے میں لکھے گئے تمام خطوط اور ڈائریوں کو جنگ کے بعد اکٹھا کیا جائے گا۔فوراً سب میری ڈائری کی طرف لپکے۔فرض کرو اگر میں خفیہ خانے (secret annexe) کے رومانس کے بارے میں شائع کروں تو کتنا دلچسپ ہو۔ محض عنوان ہی لوگوں کے لیے اُس کو ایک جاسوسی کہانی کے طور پر سمجھنے کے لیے کافی ہوگا۔

لیکن جنگ سے دس سال بعد یہ واقعی بہت دلچسپ ہوگا اگر ہم یہودی بتائیں گے کہ ہم نے یہاں (اس خفیہ خانے میں) کیسے اپنے شب و روز گذارے، کیا کھایا اور کس بارے میں باتیں کیں۔اگر چہ میں تمھیں بہت کچھ بتاتی ہوں اس کے باوجود بھی تم ہماری زندگیوں کے بارے میں بہت کم جانتی ہو۔

ہوائی حملوں کے دوران عورتیں کتنی خوفزدہ ہیں۔مثلاً گذشتہ اتوار جب ۳۵۰ برطانوی جہازوں نے ljmuden پر نصف ملین کلو بم پھینکے تو گھر ایسے کانپنے لگے جیسے ہوا میں گھاس لہراتی ہے اور کون جانتا ہے کہ اب کتنی وبائیں پھیل رہی ہیں۔تم اِن سب چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور اگر میں تمھیں یہ سب تفصیل سے بتانے لگی تو مجھے پورا دن لکھتے رہنے کی ضرورت ہوگی۔لوگوں کو سبزیاں اور ضرورت کی دیگر اشیا لینے کے لیے گھنٹوں قطار میں کھڑے رہنا پڑتا ہے۔ڈاکٹر مریضوں کو دیکھنے کے لیے جانے سے قاصر ہیں کہ اگر وہ ایک لمحے کے لیے اپنی گاڑیوں سے منہ موڑ لیں تو یہ چوری ہو جاتی ہیں۔چوریاں اور ڈکیتیاں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ سمجھ نہیں آتا ولندیزی لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اتنے مکار ہو گئے ہیں۔دس سے گیارہ سال کی عمر کے چھوٹے بچے لوگوں کے گھروں کی کھڑکیاں توڑ کر جو کچھ ہاتھ آتا ہے چُرا لیتے ہیں۔کوئی بھی اپنے گھر کو پانچ منٹ کے لیے بھی اکیلا چھوڑنے کی ہمت نہیں کرتا کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ اگر وہ جائیں گے تو اُن کی چیزیں بھی چلی جائیں گی۔ہر روز یہاں اخبارات میں چوری کیے ہوئے ٹائپ رائٹر، ایرانی قالین، گھڑیاں، کپڑے اور بہت سی اشیا وغیرہ کے لوٹانے پر انعامات کی پیشکش کے اعلانات ہوتے ہیں۔ سڑکوں پر لگے الیکٹرک کلاک کا قلع قمع اور عوامی ٹیلی فونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ہے۔

لوگوں میں حوصلے زیادہ بلند نہیں ہو سکتے۔ سب بھوک کے ستائے ہوئے ہیں، کافی کے متبادل کے علاوہ ہفتے کا راشن دو دن کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ حملہ ایک طویل وقت میں ہونے والا ہوگا اور لوگوں کو جرمنی جانا ہوگا۔ بچے یا تو بیمار ہیں یا ناکافی خوراک کی وجہ سے کمزور ہیں اور سب لوگ پرانے کپڑے اور جوتے پہنے ہوئے ہیں۔ بلیک مارکیٹ میں ایک تلوا ساڑھے سات فلورِنز کا ملتا ہے۔ مشکل ہی سے کوئی موچی جوتا مرمت کرنے کے لیے لیتا ہے اور اگر وہ قبول کر لے تو آپ کو کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا ہے جس کے دوران جوتے زیادہ تر غائب ہو جاتے ہیں۔

اس سب کے دوران ایک مثبت پہلو ہے: جیسے جیسے کھانا بدتر اور لوگوں کے خلاف اقدامات مزید سخت ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے حکام کے خلاف بغاوت بتدریج بڑھتی جاتی ہے۔ راشن بورڈ، پولیس، افسر سب یا تو اپنے ساتھی شہریوں کی مدد کر رہے ہیں یا انھیں جیل بھیج رہے ہیں۔ خوش قسمتی سے ولندیزیوں کی معمولی شرح غلط سمت میں ہے۔

تمھاری

این فرینک

(۲)

اپریل ۱۹۴۴ء

ہمیں شدت سے یاد کرایا گیا ہے کہ ہم یہودی ہیں، جو زنجیروں سے جکڑے ہوئے ہیں، جن کے کوئی حقوق نہیں ہیں لیکن ہزار ذمہ داریاں ہیں۔ ہمیں اپنے جذبات کو ایک طرف رکھنا ہوگا۔ ہمیں بہادر اور مضبوط ہونا ہوگا اور بغیر شکایت کیے اپنی مشکلات کو برداشت کرنا ہوگا۔ ہمارے بس میں جو کچھ ہے وہ کرنا ہوگا اور خدا پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ ایک دن یہ خوفناک جنگ ختم ہوگی اور وہ وقت آئے گا، جب ہم صرف یہودی نہیں بلکہ انسان سمجھے جائیں گے۔

ہمیں اس مشکل میں کس نے ڈالا ہے؟ کس نے ہمیں سب سے الگ کر دیا ہے؟ کس نے ہمیں اتنی تکلیف میں ڈالا ہے؟ وہ خدا ہے۔ جس نے ہمیں ایسا بنایا ہے اور وہ خدا ہی ہے جو ہمیں اس مشکل سے نکالے گا۔ دنیا کی نظر میں ہم برباد ہو گئے ہیں لیکن اگر اس تکلیف سے گذرنے کے بعد دنیا میں کوئی یہودی بچ گئے تو وہ پوری دنیا کے لیے مثال بن جائیں گے۔ کیا معلوم ہمارا مذہب دنیا کو اور اس سب میں لوگوں کو اچھائی کا سبق دے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس تکلیف سے گذرنا پڑ رہا ہے۔

ہم کبھی بھی صرف ولندیزی، انگریز وغیرہ نہیں ہوں گے۔ ہم ہمیشہ یہودی بھی ہوں گے۔ بس تب ہی ہم خوشی سے یہودی ہونا چاہیں گے۔

بہادر بنو! ہمیں اپنا فرض یاد رکھنا ہے اور اسے شکایت کیے بغیر نبھانا ہے۔ کوئی راستہ ضرور نکلے گا۔ خدا نے ہمارے لوگوں کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑا۔ دنیا میں یہودیوں نے بہت تکلیف اٹھائی ہے لیکن وہ ہمیشہ جیتے رہے ہیں۔ صدیوں کی مشکلات نے انھیں اور طاقتور بنایا ہے۔ کمزور کو زوال اور طاقتور ضرور جیتے گا۔

مجھے اس رات واقعی لگا تھا کہ میں مرنے والی ہوں۔ میں پولیس کا انتظار کر رہی تھی اور جنگ میں کسی فوجی کی طرح موت کے لیے بالکل تیار بیٹھی تھی کہ میں اپنے ملک کے لیے خوشی سے جان دے دوں۔ لیکن اب جب میں بچ گئی ہوں، میری خواہش ہے کہ جنگ کے بعد میں ایک ولندیزی شہری بنوں۔ مجھے لوگ بہت پسند ہیں۔ مجھے اس ملک اور اس کی زبان سے محبت ہے۔ اور میں یہاں کام کرنا چاہتی ہوں۔ اگر مجھے اس مقصد کے لیے ملکہ کو بھی خط لکھنا پڑا تو میں لکھوں گی، میں تب تک ہار نہیں مانوں گی جب تک میں کامیاب نہیں ہو جاتی!

میں بہت خودمختار ہوتی جا رہی ہوں۔ بے شک میں کم سِن ہوں لیکن میں ہمت سے زندگی کا سامنا کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں زندگی سے کیا چاہتی ہوں۔ میرے پاس ایک مقصد ہے۔ ایک رائے ہے۔ ایک مذہب ہے اور پیار ہے۔ اگر میں جیسی چاہتی ہوں ویسی بن سکوں تو میں مطمئن ہوں گی۔ مجھے معلوم ہے کہ میں ایک عورت ہوں، ایک عورت جس کے اندر بہت طاقت اور بے انتہا ہمت ہے!

اگر خدا نے مجھے جینے دیا تو میں اپنی ماں سے بہت زیادہ ترقی کروں گی۔ میں اپنی آواز دنیا تک پہنچاؤں گی۔ میں دنیا میں باہر نکلوں گی اور انسانیت کی بہتری کے لیے کام کروں گی۔

مجھے اب پتہ چل گیا ہے کہ سب سے پہلے ہمت اور خوشی چاہیے ہوتی ہے۔

تمھاری

این فرینک

(زینب خواجہ لمز کی طالبہ ہیں)

فیضان صفدر علی

کس کا ڈر ہے

نئی صدی اپنے ساتھ ایک نیا کرشمہ لے کر آئی تھی۔ دنیا کے لوگوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ اب کسی شخص میں موجود اچھائی یا برائی کو اس معیار پر پرکھا جائے گا کہ اس کے بارے میں لوگ کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس اسکیم کو فعال بنانے کے لیے ایک آلہ بنایا گیا۔ اس آلے کے دو کام تھے۔ ایک کام یہ تھا کہ اس نے دوسرے لوگوں کی رائے کو ریٹنگ کے نظام کی طرز پر پانچ میں سے ظاہر کرنا تھا۔ جب کہ دوسرا کام یہ تھا کہ کسی بھی شخص سے ملاقات کے بعد اس شخص کو کل پانچ نمبروں میں سے ریٹ کرنا ممکن بنایا جائے۔ یہ ریٹنگ اس بنیاد پر کی جاتی ہے کہ اس شخص کے ساتھ آپ کی ملاقات کیسی رہی اور وہ آدمی یا عورت آپ کو کیسی لگی۔ اس ریٹنگ کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ ملاقات کرنے والے دونوں افراد کو اس وقت تک دوسرے شخص کی جانب سے کی جانے والی ریٹنگ کا پتا نہیں لگتا تھا جب تک کہ وہ شخص خود بھی اُسے ریٹ نہ کر دے۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے سے ملاقات کے بعد چوبیس گھنٹے کے دورانیے میں اسے ریٹ نہ کرے تو آلہ بذاتِ خود پانچ ریٹ کر دیتا تھا۔

آمنہ کی ریٹنگ 4.2 ہے۔ اس کا ایک بھائی ہے جس کی ریٹنگ 4.4 ہے۔ وہ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ آمنہ ایک بینک میں کام کرتی ہے جب کہ اس کا بھائی سارا دِن گھر میں روٹیاں توڑتا ہے۔ آمنہ کو اس کے کام نہ کرنے پر بہت غصہ آتا ہے، وہ اسے ہر وقت کہتی رہتی ہے کہ کچھ کام کر لو لیکن وہ سنتا کہاں ہے۔ آمنہ ایک بہت مشہور لڑکی نہیں ہے۔ آفس میں زیادہ تر لوگ اسے نہیں جانتے لیکن وہ جن سے ملتی ہے بہت اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آتی ہے۔ اب آیا یہ ریٹنگ کے نظام کا کمال ہے یا کہ وہ واقعی ایسی ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ اس سے ملنے والے تمام لوگ

اس کو اچھا کہتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنی اچھی ریٹنگ برقرار رکھنے میں کامیاب ہے۔ نئے لوگ بھی اس سے بہت اچھی طرح ملتے ہیں اور وہ بھی ان سے بہت اچھی طرح ملتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کہ اسے لفٹ میں ایک عورت ملی جس کی ریٹنگ 4.8 تھی۔ آمنہ نے سوچا کہ اگر اس سے اچھی ریٹنگ مل جائے تو بہت اچھا ہوگا۔

''کیا حال احوال ہیں'' آمنہ نے پوچھا۔ وہ عورت پہلے تو گھبرائی لیکن آمنہ کی 4.2 ریٹنگ دیکھ کر کچھ یوں پرسکون ہوئی کہ جیسے کوئی طوفان آیا اور پھر ٹل گیا۔

''میں ٹھیک ہوں'' عورت نے کہا اور پھر ایک لمبی خاموشی ان کے درمیان حائل ہوگئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ دونوں بات کرنا چاہ رہے ہیں لیکن کوئی چیز انہیں روکے ہوئے ہے۔ آمنہ کو اس کی ریٹنگ چاہیے تھی لہٰذا اس نے ہی گفتگو میں پہل کی۔

''آپ کہاں کام کرتی ہیں؟''

''تیسری منزل پر'' عورت نے جواب دیا۔

''تو پندرھویں منزل پر کیسے جارہی ہیں؟'' آمنہ نے ایک اور سوال پوچھا۔

''تنخواہ کے سلسلے میں'' عورت نے جواب دیا اور ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ جاتے ہوئے اس عورت نے آمنہ کو اچھی ریٹنگ دی، جواب میں آمنہ نے بھی کچھ ایسے ہی ریٹ کیا۔

اس ریٹنگ کے نظام نے لوگوں کو عجیب سا کر دیا تھا۔ ہر شخص کسی دوسرے سے بہت اچھی طرح ملتا کہ کہیں وہ اُسے برا ریٹ نہ کردے۔ اس نظام کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اگر کوئی اچھی ریٹنگ والا کسی کو اچھا یا برا ریٹ کرتا تو اس کا اگلے کی ریٹنگ پر زیادہ اثر پڑتا۔ جب کہ چار سے کم ریٹنگ والے جب ریٹ کرتے تو اس کا نسبتاً کم اثر ہوتا تھا۔

دنیا کی ہر چیز کا دارومدار اب لوگوں کی ریٹنگ پر تھا۔ اچھی ریٹنگ والوں کو بہتر نوکری، کم قیمت پر سامان اور دیگر کئی سہولیات ملتیں۔ آمنہ کو ایک گھر پسند آیا تھا لیکن اس کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ آمنہ کو معلوم ہوا کہ اگر اس کی ریٹنگ 4.5 ہوتی تو اُسے بیس فیصد رعایت ملتی اور نتیجتاً اس گھر کی قیمت اس کی مالی استطاعت کے دائرے میں

آ جاتی۔

اب آمنہ اپنی ریٹنگ بڑھانے کی فکر میں مبتلا ہوگئی۔ وہ ہر کسی سے اچھی طرح ملنے لگی۔ اس کی ایک دوست مومل نے حال ہی میں اپنی ریٹنگ بڑھائی تھی۔ آمنہ نے ریٹنگ بڑھانے کے گُر جاننے کے لیے اس سے رابطہ کیا۔

''ہیلو مومل کیسی ہو؟''

''آمنہ تم نے بڑے دنوں بعد یاد کیا ہے۔''

''کیا میں تم سے مل سکتی ہوں؟''

''ہاں ضرور کل کلب میں ملتے ہیں۔'' مومل نے ہامی بھری۔ اگلے دن جب آمنہ مومل سے ملنے گئی تو حیران رہ گئی۔ آمنہ اسے دیکھنے کے بعد تمام وقت یہی سوچتی رہی کہ ایک ایسی لڑکی جس کا اسکول میں ہر شخص مذاق اڑایا کرتا تھا اور جس کی ریٹنگ کبھی 2.5 تھی، یکا یک اتنی تبدیل کیسے ہوگئی۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ تاہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ وہ بہت دیر تک بیٹھیں اپنے پرانے قصے یاد کرتی رہیں۔ پھر آمنہ نے پوچھا:

''مومل تم نے اپنی ریٹنگ کیسے بڑھائی؟''

''بہت آسان ہے یار! بس تم کسی ایسی جگہ پر جاؤ جہاں بہت سارے اشرافیہ (4.5 سے زیادہ ریٹنگ والے افراد) ہوں اور ان سے اچھی طرح ملو۔ وہ تمھیں اچھی ریٹنگ دیں گے اور تم بھی اشرافیہ میں شمار ہونے لگو گی۔'' مومل نے بتایا۔ لیکن وہ کس جگہ جایا کرتی تھی، یہ نہ مومل نے بتایا اور نہ ہی آمنہ نے پوچھا۔

اب آمنہ سوچنے لگی کہ ایسی کون سی جگہ ہو سکتی ہے جہاں بہت سارے اشرافیہ ہوں؟ اس نے یہ تلاش اپنے آفس سے شروع کی۔ وہ سب اشرافیہ کے پاس جاتی اور ان سے اچھی طرح ملتی۔ اس تگ و دو سے یہ فائدہ ہوا کہ اس کی ریٹنگ بڑھ کر 4.3 ہوگئی۔ اتفاق سے ایک دن اس کی دوست مومل کا فون آیا۔ مومل نے اُسے بتایا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے اور چونکہ آمنہ اس کی سب سے اچھی دوست ہے، اس لیے شادی میں اس کی شرکت بہت ضروری ہے۔ آمنہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ مومل نے اُسے بتایا کہ شادی کی تقریب کراچی میں ہے اور اسے اُدھر آنا ہوگا۔ آمنہ سوچنے لگی کہ وہ شادی کی تقریب میں ایک جذباتی تقریر کرے گی۔ اس کی تقریر سن کر سب اسے اچھا ریٹ کریں گے

اور پھر وہ اپنا گھر خرید لے گی۔

شادی کا دن قریب آنے لگا تو وہ تیاریوں میں مصروف ہوگئی۔اس نے ایک اپنی دوست کے لیے ایک قیمتی تحفہ اور ایک جوڑا خریدا۔ انھی دِنوں اس کی ملاقات ایک اور پرانی سہیلی عارفہ سے ہوئی۔عارفہ نے اسے بتایا کہ جس شخص سے موبل کی شادی ہونے جارہی ہے، وہ اور کوئی نہیں بلکہ عامر ہے۔وہی عامر جس سے آمنہ پیار کیا کرتی تھی۔ عامر بھی طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے ایک خاندان کا لڑکا تھا اور اس کی اپنی ریٹنگ بھی 4.8 تھی۔عارفہ نے اسے مزید بتایا کہ ان کے مابین موبل کی وجہ سے فاصلے بڑھے تھے اور موبل شروع سے ہی آمنہ سے جلتی تھی۔آمنہ کی تو جیسے دنیا ہی الٹ گئی۔اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ موبل نے اپنی ریٹنگ کیوں بڑھائی تھی۔لیکن اب وہ کچھ نہیں کرسکتی تھی کیونکہ اس کے لیے اس شادی میں شرکت بہت ضروری تھی۔اس کو 4.5 ریٹنگ چاہیے تھی جو وہ اس شادی سے ہی حاصل کرسکتی تھی لہٰذا وہ خاموش رہی۔

اب شادی کا دن قریب آچکا تھا۔اگلے دِن شادی تھی اور آمنہ کو آج ہی کراچی کے لیے نکلنا تھا۔جب وہ ایئر پورٹ کی طرف جانے کے لیے گھر سے نکلنے لگی تو اپنے بھائی کو سمجھایا:

''دیکھو اس کمپیوٹر کی جان چھوڑ دو اور گھر کی طرف دھیان دو۔گھر کا خیال رکھنا اور کوئی کال آئے یا کوئی مجھ سے ملنے آئے تو بتا دینا کہ میں کراچی گئی ہوں۔''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔'' آمنہ کے بھائی نے شاید اس کی بات سنی بھی نہ تھی۔وہ تو اپنی گیمز میں گم تھا۔اس پر آمنہ کو غصہ آگیا اس نے اپنے بھائی کو کوسنا شروع کردیا:

''تم کیا کرتے ہو سارا دن؟ کبھی ایک مصیبت تو کبھی دوسری۔تمھیں کھیلنے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں ہے۔ گھر کا سارا خرچہ میں چلاتی ہوں اور تمھیں بھی سنبھالتی ہوں لیکن آخر کب تک؟ کب تک ایسا ہوگا؟''

''اچھا اچھا کچھ کرتے ہیں'' اس کے بھائی نے پھر بے دلی سے جواب دیا۔آمنہ اس کا رویہ دیکھ کر طیش میں آگئی اور کمپیوٹر زمین پر دے مارا۔

''کیا تم پاگل ہو؟ کیا ہوگیا ہے تمھیں؟ ہوش میں آؤ۔'' اس کا بھائی چلایا۔

''ہاں میں پاگل ہوچکی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ شدید غصے میں باہر نکلی۔ غصے میں اس نے اپنی ہمسائی سے بدتمیزی کی جس سے اس کی ریٹنگ کم ہوگئی۔ پھر وہ ٹیکسی پکڑ کر ایئر پورٹ پہنچی اور ٹیکسی والے سے بھی غصے میں بات کی جس سے اُس کی ریٹنگ مزید کم ہوگئی۔

اب اس کی ریٹنگ 4.28 تھی۔ وہ ائیر پورٹ پہنچی تو معلوم ہوا کہ اس کی فلائٹ کینسل ہو چکی ہے۔ اس کو بہت دکھ ہوا لیکن پھر ریسپشنسٹ بولی:

''ہمارے پاس ایک فلائٹ ہے لیکن اس پر سفر کرنے کے لیے آپ کی ریٹنگ 4.3 ہونی چاہیے۔''

''دیکھیے میری ریٹنگ ابھی ابھی 4.3 سے کم ہوئی ہے۔ مجھے فلائٹ مل سکتی ہے؟''

''ہم معذرت خواہ ہیں لیکن ایسا نہیں ہوسکتا۔''

''آپ کیا چاہتی ہیں؟'' اب آمنہ کی آواز میں تلخی نمایاں ہوچکی تھی۔ ''میرا مطلب ہے کہ ابھی ابھی یہ فرق واقع ہوا ہے۔ میری دوست کی شادی ہے اور میرا جانا بہت ضروری ہے۔''

''نہیں ہم آپ کو فلائٹ پر نہیں بٹھا سکتے'' اس جواب پر آمنہ نے اسے خوب سنائیں اور بات ہاتھا پائی تک جا پہنچی جس کے نتیجے میں پولیس آگئی اور جرمانے کے طور پر اس کی ریٹنگ 4.28 سے کم کر کے 3.28 کردی گئی۔

اب وہ گاڑی کی تلاش میں نکلی۔ رینٹ اے کار سے جا کر کار پکڑی۔ 3.28 ریٹنگ کی وجہ سے اسے پرانے ماڈل کی کار ملی جس پر سفر بہت مشکل تھا۔ راستے میں پٹرول ختم ہوگیا اور پھر اس کو باقی سفر پیدل یا سواری بدل کر طے کرنا پڑا۔ راستے میں اس کے ساتھ بہت سے حادثات پیش آئے جس کی وجہ سے اس کی ریٹنگ اب 2.5 کے قریب ہو چکی تھی۔ کراچی کو جانے والی سڑک پر اسے ایک بوڑھی عورت ملی جس نے اُسے اپنے ٹرک میں بٹھایا اور اس کو بتایا کہ وہ قریبی گاؤں میں کاشت کاری کرتی ہے۔ اس عورت کی ریٹنگ 1.8 تھی۔ آمنہ کو حیرت ہوئی کہ اتنی خوش اخلاق عورت کی ریٹنگ کم کیوں ہے۔ اس نے پوچھا:

''آپ ایک اچھی عورت لگتی ہیں تو آپ کی ریٹنگ اتنی کم کیوں ہے؟''

''دیکھو بیٹا! اس دنیا میں دکھاوا چلتا ہے اور مجھے ہر بات کھلے عام کہنے کی عادت ہے جو اَب لوگوں میں ختم

ہوتی جا رہی ہے۔'' پھر وہ کچھ سوچنے لگی اور ایک لمبی سی آہ لے کر اس نے بتایا کہ وہ بھی کسی دور میں اشرافیہ میں شمار ہوا کرتی تھی۔ تب اس چیز کو دیکھا جاتا تھا کہ کوئی کتنا سچا اور مخلص ہے لیکن اب صرف دکھاوے کی بنیاد پر درجہ بندی کی جاتی ہے۔''

اس عورت نے آمنہ کو کراچی کے پاس اتار دیا۔ اب آمنہ کی ریٹنگ 2.3 ہو چکی تھی۔ اس نے ایک ٹیکسی روکی اور مومل کے گھر پہنچی۔ مومل کے گھر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ 3.5 سے کم ریٹنگ والوں کو اندر نہیں جانے دیا جا رہا۔

''میں مومل کی دوست ہوں! اسے بلاؤ وہ آپ کو بتائے گی۔'' اس کا پیغام اندر پہنچا اور مومل باہر آئی۔

''دیکھو آمنہ یہاں بہت سے اشرافیہ ہیں۔ لہٰذا تماشا نہ بناؤ اور واپس چلی جاؤ۔'' اس نے صاف صاف بتایا۔ آمنہ نے اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ یہ شادی آمنہ کے لیے بہت ضروری تھی چنانچہ اس نے پیچھے سے اندر جانے کا سوچا۔ اس نے عقبی دیوار پھلانگی اور گھر کے گیراج سے ہوتے ہوئے صحن میں آئی جہاں نکاح کی رسم ہونے ہی والی تھی۔

اس کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ دن بھر سڑک پر گذارنے کی وجہ سے اس کے کپڑے میلے ہو چکے تھے اور کہیں کہیں سے پھٹ بھی چکے تھے۔ تھکاوٹ کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں اور وہ چڑیل لگ رہی تھی۔ لوگوں نے دیکھتے ہی چیخنا شروع کر دیا اور سیکیورٹی آ گئی۔ اس نے ایک میز پر پڑا ہوا چاقو اٹھایا اور بولنا شروع کیا:

''مومل! مومل میری سب سے اچھی دوست ہے۔ جب سکول میں میرا کوئی دوست نہیں تھا تو مومل میری دوست بنی اور اس نے مجھے سہارا دیا۔'' اس کی آواز میں گھبراہٹ اور چہرے پر خوف تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے اس عمل کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا لیکن وہ بولتی گئی۔ اتنے میں گولی چلی۔ یہ گولی آمنہ کی ٹانگ پر لگی اور وہ درد سے چلانے لگی۔ مومل نے آگے بڑھ کر اسے اٹھانا چاہا تو آمنہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی:

''تم نے میرا عامر مجھ سے چھین لیا۔ تم ایک طوائف ہو۔ تم کم ظرف ہو۔ کیوں کیا تم نے ایسا؟''

اب وہ جیل میں تھی اور اس کے سامنے بیٹھا شخص مسکرا رہا تھا۔ آمنہ نے پوچھا:

''تم مسکرا کیوں رہے ہو؟''

''کیوں کہ یہ جگہ قید نہیں رہائی ہے۔''اس نے جواب دیا۔آمنہ کچھ نہ سمجھی اور پھر وہ شخص اسے گالیاں دینے لگا۔

''تم ایسا کیسے کر سکتے ہو میں ابھی تمھیں ریٹ......'' یہ کہتے کہتے آمنہ رک گئی۔ پھر آمنہ نے بھی اس شخص کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ باہر سے ایک افسر نے انھیں خاموش ہونے کا کہا تو آمنہ چلائی:

''اب کس کا ڈر ہے! اب کس کا ڈر ہے!''

(فیضان صفدر علی لمز کے طالب علم ہیں)

عشنا نصرت

غسل

دیوار کے کونے میں بنے روشن دان سے اذان کی آواز برسوں پرانے جالوں کے باریک دھاگوں سے چھن کر آرہی تھی۔ زمین پر گیس کے پائپ سے جڑا ایک زنگ آلود چولھا رکھا ہوا تھا۔ زنگ آلود پائپ پر میل اور چکنائی کی ایک کالی پرت جم گئی تھی۔ چولھے کے چاروں پائے کچے فرش کی نرم زمین میں دھنس گئے تھے۔ اس عمر رسیدہ چولھے کا ایک پایا زنگ سے اِس قدر تباہ ہو چکا تھا کہ توازن برقرار رکھنے کے لیے ماچس کے ڈبے کی ایک کچلی ہوئی صورت اس کے نیچے ٹھونس دی گئی تھی۔ چولھے کی یہ خستہ حالت پتا دیتی تھی کہ اس نے اپنے مالک کا بہت سے اچھے برے دنوں میں پیٹ پالا ہے۔

روشن دان سے آنے والی ہوا کے جھونکوں کی تال پہ چولھے کی لو یوں ناچ رہی تھی جیسے ان کے بیچ کوئی ایسی گفتگو چل رہی ہو جس کو سننے سے کوئی اور شے قاصر ہو۔ کمرے میں پھیلی خاموشی اُبلتے پانی کے شور کی وجہ سے لاتعداد کرچیوں میں ٹوٹ کر بکھر رہی تھی۔ ہر بلبلے کے پھٹنے سے خاموشی کی ایک پوشیدہ دیوار چیخ جاتی۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ چولھے کی آنچ بند کر کے راشدہ نے دیگچی کو ڈھک دیا اور ساتھ ہی پڑے ایک میلے تولیے کے کپڑے سے دیگچی کو پکڑ کر پانی بالٹی میں انڈیل دیا۔ پانی ڈالتے وقت بھاپ کا جو بھبکا راشدہ کے چہرے سے ٹکرایا تو ایک لمحہ اسے یوں لگا جیسے اس کے چہرے کی سختی اور جھریاں نرم پڑ گئی ہوں۔ بالٹی میں پانی بھرتے ہی راشدہ نے کراہتے ہوئے اپنی جھکی ہوئی کمر پر ہاتھ رکھا اور آہستہ آہستہ اپنی پیٹھ کو یوں سیدھا کرنے لگی جیسے کسی درخت کی پھلوں سے لدی ڈالی سے پھل ٹوٹ کر گر گئے ہوں اور ان کے وزن سے آزاد ہو کر ڈالی نے واپس اپنی اصل حالت اختیار کر لی ہو۔

پانی گرم کر کے راشدہ نے اپنی جہد کے دوسرے مرحلے کی طرف قدم بڑھانا شروع کیے۔ بالٹی کو غسل خانے کی چوکھٹ تک لا کر راشدہ یوں نڈھال ہوگئی جیسے ابھی ابھی میلوں کا فاصلہ طے کر کے آئی ہو۔ اس کی سانس اتنی تیزی سے چل رہی تھی کہ اسے دل کی دھڑکن کے علاوہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ سینہ اتنی تیزی سے پھولتا کہ گویا اپنی بچی کھچی زندگی کے باقی ماندہ تمام سانسوں کو اپنے اندر یک دم بھر لے اور پھر کھڑکھڑاہٹ کی آواز کے ساتھ یوں سماتا کہ جیسے اس کے جکڑے ہوئے سینے نے سانس بھرنے کی اجازت ہی نہ دی ہو۔

بالٹی میں پانی کی لہریں کونوں سے ٹکرا کر واپس درمیان میں آ رہی تھیں اور یوں گمان ہوتا تھا کہ ان لہروں کی جنبش سے گرماہٹ بھاپ کی صورت میں اوپر اٹھ رہی تھی۔ راشدہ نے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں، اس کی پلکیں آنکھوں کے نیچے کھنچی ہوئی گہری لکیروں کے درمیان موجود پسینے کی بوندوں میں ڈوب کر بھیگ گئیں۔ پھر جیسے وقت گذرنے کے احساس نے اس میں زندگی بھر دی ہو۔ اس نے جھٹ آنکھیں کھولیں اور ''بسم اللہ!'' کا ادھورا نعرہ لگا کر بالٹی چوکھٹ کے اس پار رکھ دی۔ مگر جیسے ہی بالٹی فرش میں پڑے ایک گڑھے میں گر کے ذرا ہلی، کھولتے ہوئے پانی کی ایک زوردار چھینٹ راشدہ کی کلائیوں پہ جا گری۔ بڑھاپے کے بہت سے عذابوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جسم کے ہر حصّے سے جلد نے گوشت چھوڑ دیا تھا۔ اس وجہ سے جلد سمٹ کر ایسے جھلس گئی تھی کہ جیسے جھریوں کا انبار جمع ہو گیا ہو۔ کھولتے پانی کی تپش سے کلائی کی ہلکی نیلی اور ہری نسیں ابھر کر باہر آنے لگی تھیں۔ راشدہ نے تکلیف سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں کے بیچ دبا لیا اور آنکھوں کو یوں کس کے بند کر لیا جیسے سامنے کوئی برا خواب کھڑا ہو۔ کلائی کا وہ حصّہ جو ابھی جلا تھا، سُرخ ہونا شروع ہو چکا تھا۔

بالٹی میں رکھا پانی ٹھنڈ کی وجہ سے تیزی سے اپنی گرماہٹ کھو رہا تھا۔ روشن دان سے اذان کے ساتھ آنے والی ٹھنڈک سے راشدہ کی جلی ہوئی جلد کے اردگرد بال کھڑے ہو گئے تھے۔ وقت گذر رہا تھا اور اس جہد کا آخری مرحلہ راشدہ کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

اپنے ٹھٹھرتے ہوئے جسم سے راشدہ نے اس قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ کپڑوں کو اتارا کہ جیسے وہ اس کا لباس نہ ہو بلکہ کسی چھلکے کی طرح اس کے جسم کا حصّہ ہو۔ غسل خانہ بھی ایسا تھا کہ کپڑے دھونے کی جو جگہ گھر کے ایک کونے میں

مخصوص تھی، اس ہی کے گرد پرانی چادر کا پردہ ڈال کر اسے غسل خانہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ چادر میں بھی جگہ جگہ سوراخ تھے جن میں سے روشن دان کی ہوا گذر کر آرہی تھی۔ پردہ چونکہ زمین سے ڈیڑھ فٹ اونچا تھا اس لیے ٹانگوں کی طرف سے ہوا کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ راشدہ نے اپنے دائیں اور بائیں پاؤں کو یوں چمٹا رکھا تھا کہ جیسے کسی نئی نویلی دلہن نے شرم سار ہو کر گود میں ہاتھ بھینچ لیے ہوں۔ جالی کے ایک پرانے دوپٹے کو راشدہ نے اپنا جسم مانجھنے کا جھانواں بنالیا تھا۔ اسے لے کر راشدہ نے اپنا جسم ملنے کی کوشش کی تو ایک دو دفعہ ہاتھ مارنے کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے خون کی روانی رک گئی ہو۔ ناخنوں کے اندر اور گردن کے پچھلے حصّے میں میل کی باریک دھاریاں بڑی صفائی سے بنی ہوئی تھیں۔ دوپٹے کا ٹکڑا راشدہ نے اسی لیے رکھا ہوا تھا کہ اگر اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے میل نہ اتار سکے تو کپڑے کی مدد سے بات بن جائے۔ مگر گدی پر پڑتے ہی اس کا ہاتھ بے جان ہو کر رہ گیا۔

بالٹی کے قریب غسل خانے کے فرش پر ایک چھوٹی سی نالی تھی جس کی زنگ آلود جالی آدھی گل چکی تھی۔ صابن کا جھاگ اور ہلکے سُرمئی رنگ کا پانی راشدہ کے جسم سے بہہ کر نالی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پانی جسم کے چپے چپے سے اس قدر خاموشی سے بہہ رہا تھا کہ جیسے اپنے ساتھ وجود کا کوئی حصّہ چرا کر لے جا رہا ہو۔

فرش پر پانی کی جو لہر نالی کی طرف اپنا رُخ کر رہی تھی اس پر نہ صرف راشدہ کے جسم کا میل سوار تھا بلکہ اس کے وجود کے چیتھڑے بھی جلوس کے ہمراہ اپنا جنازہ اُٹھائے چلے جا رہے تھے۔ راشدہ کی نظریں پانی کے اس جلوس پر جمی ہوئی تھیں۔ لہر جس راستے پر بہتی جا رہی تھی، اس کے ہر قدم پہ راشدہ کی نظر لڑکھڑا جاتی اور آنکھوں کی روشنی مدھم ہو جاتی۔ وہ لہر اپنے ساتھ راشدہ کا ماضی، اس کا حال اور اس کے مستقبل کی امید بھی بہا کر لے جا رہی تھی۔

جب آدھا جسم نہا چکا اور بقیہ حصّوں پر صابن اسی طرح جما رہا تو لگتا تھا جیسے یہ دو مناظر راشدہ کی مختصر زندگی کا موازنہ کر رہے ہیں۔ ابھی کچھ جان تھی، اور کچھ جا چکی تھی۔ چند دہائیاں گذر چکی تھیں اور کچھ لمحے باقی رہ گئے تھے۔ کچھ یادیں ذہن سے دُھل گئی تھیں اور کچھ کا میل ابھی بھی کونوں کھدروں میں باقی تھا۔

راشدہ نے آخری بار پانی کو سر پر ڈالنا چاہا، مگر اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ ہاتھ میں ڈبہ اٹھاتے ہی ہاتھ بالٹی میں گر گیا۔ صابن کے جھاگ سے بھرا وہ سُرمئی پانی نالی کے گرد طواف کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اندونی لہریں

نالی میں غائب ہوتی جارہی تھیں۔راشدہ کا جسم ٹھنڈا پڑنے لگا،اس کی کمر مزید جھک گئی اور سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ اس کی نظریں جیسے نالی کے پاس ہونے والی گردش پر اٹک گئی تھیں مگر بھیگی پلکوں کے وزن سے آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگی تھیں۔ہونٹوں کے دونوں طرف جھُریاں یوں گڑی ہوئی تھیں جیسے ہر لکیر گذری زندگی کے کسی دور کی داستان ہو۔جولب اب تک سلے ہوئے تھے وہ اب کُھل کراُکھڑی سانسوں کو جگہ دے رہے تھے۔

نالی کے گرد سارا پانی اب بہہ چکا تھا۔صابن کا ذرا سا جھاگ جالی کے سُوراخوں میں ایسے اٹکا ہوا تھا جیسے کوئی بے بس وجود سُولی پر لٹکا تڑپ رہا ہو۔بالٹی میں پڑا باقی ماندہ پانی تقریباً ٹھنڈا ہو چکا تھا۔صابن کا ایک بلبلہ بالٹی میں پڑے پانی کی سطح پر جُھوم رہا تھا۔روشن دان سے آنے والی ٹھنڈی ہوا مزید سرد ہوگئی تھی۔غسل خانے کا پردہ اس ہوا میں بڑی معصومیت سے جھول رہا تھا۔غسل خانے کا گیلا فرش کچھ حد تک خشک ہو چکا تھا مگر ابھی بھی کچھ حصوں پر پانی نظر آرہا تھا۔بالٹی کے ساتھ ہی راشد کا بے جان وجود ایسے پڑا ہوا تھا جیسے اس کا دھڑ بالٹی سے لٹک کر اندر پڑے بلبلوں کو جھانک کے دیکھ رہا ہو۔اس کے ناخنوں میں ہلکا نیلا رنگ نمایاں ہونے لگا تھا۔سانس اب پہلے کی نسبت بہت کم رفتار سے چل رہی تھی۔یوں لگتا تھا جیسے ایک سانس نکلنے کے بعد صدیاں گذر جائیں تو کہیں جا کر دوسرے سانس کے آثار نظر آئیں گے۔چولھے کی ناچتی لو کی طرح زندگی کی ایک امید اس کے مردہ وجود میں اب تک پھڑک رہی تھی۔

(عشا نصرت لمز کی طالبہ ہیں)

عائشہ جمیل

اُس پار

محمد شاہ نے اپنی وہ کہانی تین سال قبل سنائی تھی جو ہمیشہ کے لیے مجھے ذہن نشین ہو گئی۔ اس نے کہانی اس خلوص سے سنائی تھی کہ مجھے ماننا ہی پڑا کہ یہ ایک حقیقت ہے۔ اگلے دن جب میں اپنے بستر میں اٹھا تو محمد شاہ کی دھیمی لیکن مخلص آواز بدستور میرے دماغ اور سر میں گونج رہی تھی۔ بستر میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے بھی یہ خیال مجھے تنگ کرتا رہا کہ محمد شاہ نے پچھلی رات مجھے جو کچھ بتایا، کیا وہ صرف ایک گھڑی ہوئی کہانی تھی یا اصل میں اس کی زندگی کا کوئی تجربہ...... محمد شاہ کی زندگی میں پیش آنے والا کوئی معجزہ تھا یا ایک حسین خواب۔ میں دیر تلک سوچنے کے بعد بھی یہ گتھی نہ سلجھا سکا۔ لیکن محمد شاہ کی موت کے بعد مجھے اس کی کہانی پر مکمل یقین ہو گیا۔

میں نہیں جانتا احمد کہ یہ میرا وہم تھا یا بھوت پریت۔ بس یہ سمجھو کہ وہ یاد میرے اندر کے احساسات کو جگا دیتی ہے۔

وہ چند لمحوں کے لیے رکا اور ایک گہری سانس لی۔ ایسی سانس وہ کسی بہت خوفناک یا بے حد خوبصورت چیز کے بارے میں بات کرتے ہوئے لیتا۔ شروع میں وہ کچھ ہچکچایا اور پھر اس نے مجھے اپنی زندگی کا ایک راز بتایا۔ ایک ایسی حسین چیز کا راز جو اس کے دل میں بھوک پیدا کرتا تھا اور اس کے لیے دنیاوی چیزوں کو نہایت ہی بدصورت اور غیر اہم بنا دیتا تھا۔

میرے پاس محمد شاہ کی ایک تصویر ہے جس میں اس کی آنکھوں میں بسنے والی بے نیازی کو بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ تصویر مجھے اس گفتگو کی یاد دلاتی ہے جو میرے اور اُس عورت کے مابین ہوئی تھی جو محمد شاہ سے پیار کرتی تھی۔ اس عورت نے مجھے کہا، ''ایک دم سے اس کی ساری دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ تمھیں بھول جاتا ہے اور وہ

تمھارے سامنے ہونے کے باوجود بھی وہ تمھاری فکر نہیں کرتا۔''

ہم دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے اور جب اس اسکول میں آئے تو ایک ہی سطح پر تھے لیکن آنے والے سالوں میں وہ مجھ سے بہت آگے نکل گیا۔ وہ جو بھی کرتا اس میں مہارت رکھتا تھا۔ جب کہ میں اس کے مقابلے میں اوسط درجے کا طالب علم تھا۔ میں نے پہلی بار اس دروازے کے بارے میں اسکول میں سنا اور دوسری بار محمد شاہ کی موت سے پہلے۔

محمد شاہ کے لیے یہ ایک حقیقی دروازہ تھا جو اسے لافانی حقائق سے جوڑتا تھا۔ جب وہ پانچ یا چھے برس کا تھا تو اسے یہ دروازہ پہلی بار نظر آیا۔ اس نے کہا،''وہ دروازہ جس پر ایک لال رنگ کے پتوں والی بیل تھی، وہ مجھے دھوپ میں ایک سفید دیوار پر نظر آیا۔''

محمد شاہ کا باپ ایک سخت مزاج وکیل تھا جو اپنے بچے پر بہت کم توجہ دیتا تھا لیکن اپنی اُمیدوں کا سارا بوجھ اسی پر ڈالے رکھتا۔ محمد شاہ کو بچپن ہی سے اندازہ تھا کہ اگر وہ اس دروازے کے دوسری طرف گیا تو وہ اپنے والد کو ناراض کر بیٹھے گا۔ محمد شاہ کو چالیس سال کی عمر تک وہ دن یاد تھا جب وہ دکانوں سے چیزیں خریدنے کا ڈھونگ رچا کر اس ہرے رنگ کے دروازے کے پار گیا تھا اور دروازے کے دوسری طرف جا کر اس نے ایک ایسا باغ دیکھا جس کی تصویر اس کو پوری زندگی پریشان کرتی رہی۔ اس باغ کے اندر ایک آزادی اور اچھائی کا احساس تھا۔ ایک ایسا احساس جس سے سارے رنگ صاف ہو جاتے تھے اور ہر جگہ روشن ہو جاتی تھی۔ اس جگہ ہر چیز خوبصورت تھی۔ محمد شاہ کہا کرتا تھا،''اس باغ میں مجھے دو شیر نظر آئے لیکن میں ڈرا نہیں۔ ان میں سے ایک میرے پاس آیا اور پیار سے میرے ہاتھ کے ساتھ اپنا سر ملنے لگا۔ باغ اتنا بڑا تھا کہ جہاں تک نظر گئی وہاں تک سبزہ ہی سبزہ نظر آیا، مجھے ایسا لگا کہ میں اپنے گھر واپس آ گیا ہوں۔ اس ہرے دروازے میں داخل ہوتے ہی میں وہ گندی دکانیں، گاڑیاں، لوگ، گھر اور ہچکچاہٹ سب بھول گیا۔ اس باغ میں مجھے دو ساتھی ملے، دو ایسے ساتھی جن کے ساتھ میں خوب کھیلا لیکن پھر اس باغ میں ایک عورت آئی اور مجھے میرے ساتھیوں سے دور لے گئی۔ اس نے مجھے ایک کتاب دکھائی جس میں تصویریں تھی۔ لیکن یہ تصویریں میری حقیقی زندگی کے متعلق تھیں جن میں میرا گھر، میری ماں، میرا باپ اور باقی لوگ تھے۔ اور پھر ایک دم سے وہ عورت، وہ

کتاب اور وہ سب کچھ غائب ہو گیا اور میں اپنی بدصورت زندگی میں واپس آ گیا۔ میں روتا روتا اپنے گھر بھاگا۔ ایک ایسے گھر جہاں نہ تو کوئی شیر تھا، نہ ہی کوئی ساتھی اور نہ ہی کوئی عورت۔ گھر پہنچ کر میں نے اپنے باپ اور پھوپھو کو یہ کہانی سنائی تو مجھے ڈانٹ پڑی اور میری کہانیوں کی ساری کتابیں چھین لی گئیں۔ کچھ سال بعد جب میں چھٹی جماعت میں آ گیا تو ایک دن اسکول کے لیے دیر ہو رہی تھی اور میں نے ایک شارٹ کٹ اپنانے کی کوشش کی۔ لیکن پھر یہ ہوا کہ میں الگ الگ گلیوں میں بھاگتا بھاگتا سکول کی بجائے اسی دروازے کے سامنے جا پہنچا۔ میں نے اس دروازے کو غور سے دیکھا اور پھر مجھے خیال آیا کہ مجھے اسکول کے لیے دیر ہو رہی ہے لہٰذا مجھے چلنا چاہیے۔ مجھے اسکول پہنچ کر خوشی اس بات کی تھی کہ اب مجھے اس دروازے کا راستہ معلوم ہو چکا تھا۔ لیکن جب اسکول سے واپسی پر میں اسی راستے سے گیا تو وہ دروازہ کہیں نظر نہ آیا۔

مجھے تیسری بار وہ دروازہ سترہ سال کی عمر میں نظر آیا جب میں اپنے ملک کی سب سے اعلیٰ درجے کی یونی ورسٹی میں داخلے کا انٹرویو دینے گیا۔ میں ٹیکسی میں تھا جب ایک دم سے میری نظر اس دروازے پر پڑی لیکن پھر میں نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یونی ورسٹی پہنچنے کے لیے وقت کم ہے چنانچہ میں اپنے راستے پر چلتا رہا۔ یونی ورسٹی میں داخلہ ہونے پر مجھے اندازہ ہوا کہ اگر میں اس دروازے کے لیے رکتا تو میرے ہاتھ سے یونی ورسٹی، ڈگری اور مستقبل سب پھسل جاتا۔ اب مجھے ایک اور دروازہ اس وقت نظر آیا جب میں اپنی محبوبہ سے ملنے جا رہا تھا۔ مجھے دروازہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ دروازہ جو میرے گھر کے پاس تھا، یہاں کیا کر رہا ہے۔

اس کے بعد سالوں بیت گئے اور میں اپنی زندگی میں بے حد مصروف رہا اور کامیابیوں کے زینے چڑھتا گیا۔ سالوں مجھے یہ دروازہ بالکل نہ نظر آیا۔ لیکن حال ہی میں یہ دروازہ مجھے تین دفعہ نظر آیا ہے۔ پہلی بار جب مجھے اپنی شادی پر پہنچنا تھا، دوسری بار جب میں اپنے دم توڑتے بیمار باپ سے ملنے کے لیے ہسپتال جا رہا تھا اور تیسری بار جب مجھے میونسپل کے انتخابات جیتنے کی تقریر دینے جانا تھا۔

میں نے اس دروازے کو تینوں مرتبہ ٹھکرایا ہے۔ ایک ایسا دروازہ جو مجھے سکون، راحت اور خوشی فراہم کر سکتا تھا۔

''اب یہ دروازہ جاچکا ہے احمد۔''

''لیکن اس بات کا تمھیں کیسے پتا محمد شاہ؟''

''اب وہ دروازہ نظر آنا بند ہو گیا ہے۔اس دکھ کی وجہ سے میں نے دو ماہ سے کوئی کام نہیں کیا۔ مجھے عزت اور شہرت تو بہت ملی مگر میری اپنی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں یہ سب چھوڑ کر صرف اس دروازے کی چاہت رکھتا ہوں۔''

لوگوں کو اس کی لاش ایک تعمیراتی مقام پر کھدائی کے دوران ملی۔اس مقام پر ایک دروازہ تھا جو مزدوروں کی سہولت کے لیے بنا تھا۔اس رات مزدور اُس دروازے کو بند کرنا بھول گئے اور اس ہی دروازے کے پار جانے کے باعث محمد شاہ کی موت ہوگئی۔

میرے دماغ میں سوالات ابھر رہے تھے۔

کیا محمد شاہ کا بیان کیا ہوا ہرا دروازہ حقیقی تھا یا وہ محض اس کا ایک وہم تھا۔ ہمارے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو محمد شاہ ایک خوش حال زندگی بسر کرتے کرتے ایک بھیانک انجام کی طرف چلا گیا۔لیکن کیا اس کی نظر میں بھی دروازے کے دوسری طرف موت تھی؟

(عائشہ جمیل لمز کی طالبہ ہیں)

ثانیہ سلطان

دائرہ

اندھا دھند بھاگتے ہوئے اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ ویران اور تاریک شاہراہ اسے کہاں لے جارہی ہے مگر اُس کے پیچھے آتے قدموں کی تیز چاپ اور پیچھا کرنے والے سے مسلسل گھٹتا ہوا فاصلہ اُسے اپنی رفتار تیز کرنے پر مجبور کررہا تھا۔ مسلسل بھاگنے کی وجہ سے اس کی سانس پھول چکی تھی مگر راستہ تھا کہ ختم ہی نہیں ہورہا تھا۔ گلی میں نصب واحد کھمبے پر لٹکا بلب اندھیرا ختم کرنے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔ اس نیم تاریکی میں اس نے اپنے ہاتھوں میں تھامے کمبل میں لپٹے وجود پر ایک نظر ڈالی۔ وہ بالکل ساکت تھا۔ سڑک سے نظر ہٹنے کی دیر تھی کہ بھاگتے ہوئے اچانک اس کا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا اور درد کی ایک شدید لہر اس کے بائیں پاؤں سے ہوتی ہوئی پنڈلی تک گئی۔ کمبل میں لپٹے وجود کے گرد اُس کی گرفت ڈھیلی پڑگئی اور وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ وہ گھبرا کر اسے اٹھانے کے لیے جھکی مگر دوڑتے قدموں کی آواز اب اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ بڑے بڑے ہاتھوں نے اسے جکڑ لیا اور...... ''نہیں!''

یکدم سڑک غائب ہوگئی۔ دوڑتے قدموں کی آواز بھی غائب ہوگئی اور اس کی جگہ اس کے کچے کمرے کی چھت پر لٹکے پرانے پنکھے کی بے سُری آواز نے لے لی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ مکمل طور پر پسینے میں شرابور تھی۔ شدید پیاس سے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہورہے تھے۔ اس نے اندھیرے میں اپنی بائیں جانب پڑی لکڑی کی تپائی کو ٹٹولا جہاں وہ پانی کا ایک پرانا پلاسٹک کا جگ اور گلاس رکھا کرتی تھی، بالکل ایسے ہی موقعوں کے لیے جب یہ بھیانک خواب اسے گہری نیند سے جگا کر بٹھا دیتا تھا۔ دھیرے دھیرے آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو اس نے جگ اٹھا کر اندازے سے گلاس میں پانی ڈالا اور منہ سے لگا لیا۔ پانی گرم تھا مگر وہ پورا گلاس دو گھونٹ میں ہی حلق سے اتار

گئی۔ پسینہ ابھی بھی متواتر اس کی پیشانی سے بہہ کر گردن سے لپٹے بالوں میں جذب ہو رہا تھا۔

تین دن سے مسلسل وہ یہی ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اب ہی کیوں؟ اپنے اس سوال کے جواب میں اسے کمرے کی خاموشی ہی ملی۔ مکمل خاموشی میں پنکھے کی آواز کانوں میں اور بھی زیادہ چبھ رہی تھی۔ اپنی ساری زندگی اس پوشیدہ چار دیواری میں گذارنے کے باوجود بھی اسے اس رینگتے پنکھے کی آواز کی عادت نہ ہوئی تھی۔ کیا وقت ہوا ہوگا ابھی؟ وہ یہ سوچ کر ہی رہ گئی کیونکہ گھڑی نام کی کوئی شے تو اس کمرے کے گنے چنے سامان میں پائی نہ جاتی تھی۔ اب نیند آنکھوں سے اُڑ چکی تھی تو خدا کا نام لینے کا سوچا جس کے سہارے زندگی گذر رہی تھی۔

کوٹھوں کے اس علاقے تک اگر کبھی اذان کی آواز پہنچ بھی جاتی تو صبح شام سجنے والی رقص وسنگیت کی محفلوں میں گانوں کے شور تلے دب جاتی۔ ویسے بھی یہاں اس کے علاوہ نماز پڑھتا ہی کون تھا۔ اس نے دوفٹ کی لوہے کی زنگ آلود سلاخوں لگی کھڑکی سے ریشم کا کپڑا اٹھایا جو کسی زمانے میں اس کی بہترین ساڑھی کا پلّو ہوتا تھا مگر اب ایک پردے کا کام دیتا تھا۔ باہر اندھیرا تھا مگر دور کہیں ہلکا سا اجالا ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ فجر کا وقت تو ختم ہونے ہی والا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے پردہ برابر کیا اور پھرتی سے کمرے کے مغربی کونے کی جانب بڑھی جہاں ایک دیگچی میں اس نے اتنا پانی رکھا ہوا تھا کہ کھینچ تان کر وضو ہو ہی جائے۔ ورنہ صبح صبح باہر سے پانی لانے کے چکر میں راجو یا لالی میں سے کوئی دیکھ لیتا اور پھر اس کے گلے پڑنے کی کوشش کرتا۔ نماز پڑھ کو وہ واپس بستر پر آ کر لیٹ گئی اور رات کے خواب کے متعلق سوچتے سوچتے اس کی دوبارہ آنکھ لگ گئی۔ اور پھر تب ہی کھلی جب چاندنی اس کے سر پر کھڑی چلا رہی تھی۔

''اری او چنبیلی! مفت کی روٹیاں تو تُو توڑتی ہی ہے اور دھندا بھی تیرے بس کی بات نہیں۔ جو تھوڑا بہت کام تو کر لیتی تھی اس سے بھی گئی؟ آج صبح ہی نیا مال آیا ہے چل جا کر اس کی چھانٹی کر۔'' اس کی نیند اُڑ گئی۔

آج کن بدنصیبوں کی قسمت میں یہ سیاہی لکھی جانی تھی۔ خدا جانے یہ لوگ کون سے ماں باپ کی عمر بھر کی کمائی اڑا لائے تھے۔ ہاں وہ بھی تو اس کوٹھے پر پندرہ سال پہلے اسی طرح آئی تھی۔ اغوا شدہ لڑکیوں کی ایک ٹولی کے ساتھ۔ چاندنی تو بول بول کر جا چکی تھی، اب اسے اٹھ کر اپنا کام کرنا تھا۔ چاندنی اس کوٹھے کی کرتا دھرتا تھی۔ اس کے حکم کے مطابق اچھی شکل وصورت کی لڑکیوں کو الگ کر کے ناچ گانا سکھایا جاتا تھا جب کہ واجبی سی شکل والی لڑکیوں کو

راجو کے حوالے کر دیا جاتا جو انھیں آگے کہیں بھیج دیتا۔ اس کا نام کبھی ہاجرہ ہوتا تھا لیکن پھر وہ کب ہاجرہ سے چنبیلی بنی، اسے معلوم ہی نہ ہوا۔ انھی سوچوں کے بھنور میں پھنسی وہ اٹھ کر مشرقی دیوار پر لگے شیشے کے سامنے آ کھڑی ہوئی جس کا ایک کونہ ٹوٹا ہوا تھا اور باقی سارا سالہا سال کے استعمال سے دھندلا گیا تھا۔ پاس پڑی کنگھی اٹھا کر اس نے کمر تک آتے بال سنوارے۔ اس کے سوا مزید سنگھار بھی کیا کرنا تھا۔ وہ دن گئے جب وہ طرح طرح کے بناؤ سنگھار کیا کرتی تھی۔ اب تو تمام کارآمد کپڑے اس کے چھوٹے سے صندوق میں بند پڑے تھے۔ لیکن وقت کا سرد و گرم ابھی اس کی خوبصورتی کو مکمل طور پر ماند نہ کر پایا تھا۔ وہ ابھی بھی ویسی ہی پتلی پتنگ تھی جیسی پندرہ سال پہلے ہوا کرتی تھی۔ اس نے اپنے رات والے کپڑوں کی شکنیں ہاتھوں سے درست کیں اور کمرے کا چر چراتا ہوا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

مردہ چال چلتی ہوئی وہ کوٹھوں کے عقب میں بنے اس کمرے تک آئی جہاں نئی لائی جانے والی تمام لڑکیوں کو رکھا جاتا تھا۔ دروازے کے باہر راجو پہرہ دے رہا تھا جس نے اسے دیکھ کر پہلے اپنے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے ایک بھرپور مسکراہٹ اچھالی۔ راجو کو دیکھ کر چنبیلی کو اپنے پورے جسم پر کپڑے رینگتے محسوس ہوئے۔ قریب تھا کہ وہ کچھ کہتا، ہاجرہ اسے نظر انداز کرتی ہوئی جلدی سے لکڑی کے دروازے کا جھولتا پٹ دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔ چوکھٹ کے پار قدم رکھتے ہی کمرے کے سوگوار ماحول نے اسے پوری شدت سے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اندر برابر سسکیاں گونج رہی تھیں۔ بلب کی ملگجی روشنی میں اسے دس کے قریب لڑکیاں کمرے کے چاروں کونوں میں دبکی نظر آئیں۔ ان کی حالت نہایت ابتر معلوم ہوتی تھی۔ وہ پہلے ہی خوف سے سمٹی ہوئی تھیں، ہاجرہ کے اندر داخل ہوتے ہی خوفزدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو تکنے لگیں۔ مگر وہ چاہتے ہوئے بھی ہمدردی کے دو بول نہ بول سکی۔ اس کے بس میں کچھ تھا ہی کب۔ وہ بھی تو ان ہی کی طرح محض ایک قیدی تھی جو پندرہ برس سے چاندنی کے اشاروں پر ناچتی چلی آ رہی تھی۔ محض اس ڈر سے کہ اگر وہ یہاں سے چلی گئی تو اس معاشرے میں کوئی اس پر تھوکے گا بھی نہیں۔ سوچوں کو جھٹکتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر ان کی طرف دیکھا۔ کھڑکی کے نام پر دیوار میں ایک سوراخ تھا جس میں لوہے کی سلاخیں نصب تھیں۔ اس سے آتی روشنی میں وہ سیمنٹ کے فرش پر سہمی بیٹھی لڑکیوں کی طرف بڑھی۔

''چلو لڑکیو اٹھو۔'' اس کی آواز چاہتے ہوئے بھی کرخت نہ ہو سکی۔

یہ سنتے ہی ان لڑکیوں کی سسکیوں کی آواز رونے میں بدل گئی اور وہ سبھی خوف سے سمٹ گئیں۔ اس نے بازو سے پکڑ کر سب سے آگے بیٹھی لڑکی کو اٹھایا۔ پھر یکے بعد دیگرے سب کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا۔ اس کے ذہن میں چاندنی کی ہدایات گھوم گئیں:

''مجھے صرف گوری لڑکیاں ہی چاہئیں۔ ان ہی کی زیادہ مانگ ہے۔ اور خبردار! کوئی لڑکی موٹی نہ ہو۔ یہ کام چور راجو اور لالی بھی پتا نہیں کیسی کیسی اٹھالاتے ہیں۔''

یہ سوچتے سوچتے جب وہ آخری لڑکی پر پہنچی تو اس پر نظر پڑتے ہی ٹھٹھک گئی۔ پلستر جھڑتی دیوار سے کمر ٹکا کر وہ نہایت سکون سے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا، اور نہ ہی کوئی سسکی اس کے منہ سے برآمد ہوئی۔ اس کے انداز میں ایک طمطراق اور شاہانہ پن تھا جیسے وہ کسی کوٹھے کے بوسیدہ فرش پر نہیں بلکہ کسی تخت پر گاؤتکیوں کے ساتھ براجمان ہو؛ بالکل ویسے ہی جیسے چاندنی اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ رقص کی محفلوں کے دوران بیٹھا کرتی تھی۔ اس لڑکی کی بے خوف آنکھوں سے بغاوت جھلکتی تھی جنھیں دیکھ کر چنبیلی کو اپنا ماضی یاد آ گیا۔ وہ بھی تو اسی طرح بہادری سے حالات کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتی تھی اور باقی لڑکیوں کی طرح التجاؤں اور گڑگڑاہٹ سے ہرگز کام نہیں لیتی تھی۔ اس لڑکی کو دیکھ کر ایک عجیب سے احساس نے چنبیلی کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ لڑکی کو اٹھانے کے لیے اس نے اس کا ہاتھ تھاما مگر ایسا کرتے ہی لڑکی کے چہرے کے بائیں حصّے پر کھڑکی سے آتی ہوئی روشنی کی کرن پڑی۔ نظر پڑتے ہی چنبیلی ایک جھٹکے سے دو قدم پیچھے ہٹی۔

''نہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔'' اور اس کی نظروں میں پندرہ سال پہلے کا منظر گھوم گیا۔

''آج سے تو شام کی رقص کی محفلوں میں ناچا کرے گی۔ اور ہاں! کوئی کمی نہ رہے تیرے بناؤ سنگھار میں۔'' اور اس نے سہمے ہوئے انداز میں سر ہلا دیا۔ اب اس کے اندر کی تمام باغیانہ سوچیں دم توڑ چکی تھیں۔ اس نے خود کو حالات کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ یہاں سے بھاگ نہیں سکتی تھی اس لیے اس نے اپنے ضمیر اور روح کو گہری نیند سلا کر چاندنی کے اشاروں پر ناچنا شروع کر دیا۔ اس کی خوبصورت شکل وصورت اور رنگت دور دور سے لوگوں کو کھینچ لاتی تھی۔ اور ایک روز کوئی اتنا فریفتہ ہوا کہ ایک رات کے لیے چاندنی سے اس کے دام طے کر بیٹھا اور نتیجتاً اس کی گود میں

ایک بچی آ گئی۔ گذرے سالوں نے اسے اپنی خوبصورتی سے نفرت کرنا سکھا دیا تھا۔

''کاش میری بیٹی ہو تو اتنی بدصورت ہو کہ اسے کبھی اُس سب سے نہ گذرنا پڑے جس سے میں گذری ہوں۔'' وہ اکثر یہ دعا کرتی اور پھر یہی ہوا۔ جب بیٹی ہوئی تو اس کا رنگ گہرا سانولا تھا اور بائیں گال پر ایک بڑا سا کالا نشان تھا جس نے اس کے چہرے کے بائیں حصّے کو تقریباً چھپایا ہوا تھا۔

''شاید یہ کالا نشان ہی اِس کی زندگی پر کالک لگنے سے بچا لے۔'' اس نے دعا کی تھی۔

چاندنی نے تو اس کی بیٹی کو دیکھتے ہی اپنے انگوٹھیوں سے لدے ہاتھ اٹھا کر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ''یہ لڑکی تیرے ساتھ یہاں نہیں رہ سکتی۔ اس کی شکل کسی کام کی ہوتی تو آگے جا کر یہ بھی کچھ ناچ گانا سیکھ لیتی مگر میں یہ جی کا جنجال پالنے کی روادار نہیں۔ نکال اسے یہاں سے۔'' اور یہی وہ رات تھی جب اس نے اپنی ایک ہفتے کی بیٹی کو لے کر بھاگنے کی کوشش کی تھی جس میں وہ بری طرح ناکام ہوئی۔

اب وہی بیٹی اکثر اسے رات کو خواب میں آ کر ڈراتی تھی۔ اور جب نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور چلی جاتی تو وہ سوچا کرتی تھی کہ اس کی بیٹی کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ کیا اسے اچھا کھانا اور اوڑھنا نصیب ہوتا ہوگا یا وہ بھی دو وقت کی روٹی کی خاطر کہیں دھکے کھاتی پھر رہی ہوگی۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ سنگدل لوگ اسے کہاں چھوڑ آئے تھے۔ اس کی زندگی کے گھڑیال کی سُوئیاں تو آج بھی اسی ایک لمحے پر رکی ہوئی تھیں جب انھوں نے اس کی ایک ہفتے کی بیٹی کو اس کے ہاتھ سے چھینا تھا۔ لیکن آج وہ پھر اپنی بیٹی کے سامنے آ کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کا کالا نشان بھی اسے یہاں واپس آنے سے نہ بچا سکا تھا۔ یہ سوچ اسے ماضی سے حال میں کھینچ لائی۔ ایک مرتبہ پھر وہی کمرا اور دس لڑکیوں کی قطار اس کے سامنے موجود تھی۔ اس نے ایک نظر اپنی بیٹی پر ڈالی اور پھر فیصلہ کرنے میں اسے محض ایک لمحہ لگا۔ ان سب کو وہاں چھوڑ کر وہ الٹے قدموں واپس پلٹ گئی۔ اس دفعہ راجو کی زہریلی مسکراہٹ بھی اس کے قدموں کو آہستہ نہ کر سکی اور اپنے کمرے میں جا کر وہ رات ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

آج ایک مرتبہ پھر وہ بھاگ رہی تھی۔ اسی تاریک اور سنسان سڑک پر جس پر وہ تیرہ سال پہلے بھاگی تھی۔ مگر آج اس کے ہاتھوں میں کمبل میں لپٹا ایک نومولود نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک تیرہ برس کی لڑکی تھی۔ ایک مرتبہ پھر

اسے پیچھے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔اس سے قبل وہ ایک مرتبہ ناکام ہوچکی تھی لیکن اس دفعہ ہر حالت میں کامیاب ہونا چاہتی تھی۔ اسے اپنی بیٹی کو چنبیلی بننے سے روکنا تھا۔اور پھر اُسے خود بھی چنبیلی سے ہاجرہ بننا تھا۔

(ثانیہ سلطان لمز کی طالبہ ہیں)

حافظ محمد عمیر مظہر

بنتِ حوا

مرکزی دروازہ اس قدر وسیع تھا کہ وہ کافی دیر تک اپنی ننھی سی گردن کو اِدھر اُدھر گھما کر دروازے کے سرے ڈھونڈتی رہی۔ اتنے میں چوکیدار نے گیٹ کھول دیا اور رضیہ اس کا بازو پکڑے تیزی سے اندر کو لپکی۔ وہ بدستور گیٹ پر نظریں جمائے ماں کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ لان کی سرسبز راہداری سے ہوتے ہوئے رضیہ گھر کے اندرونی دروازے پر رُک کر اپنی سانس درست کرنے لگی۔ زینت کی نظریں ابھی تک دروازے کی وُسعت کو سمیٹنے میں مصروف تھیں۔ اچانک رک جانے پر وہ بوکھلا سی گئی۔ سب منظر دھندلا کر زینت کے چہرے پر مرکوز ہو گئے اور وہ مورت بنی ماں کو دیکھنے لگی۔ رضیہ نے دوپٹے کے کناروں سے آنکھوں کو پونچھا اور زینت کے کندھوں پر پڑے بوجھ کو بڑے سلیقے سے سر پر اوڑھانے لگی۔

''یہ ریحان صاحب کا گھر ہے۔ بہت بڑے آدمی ہیں صاحب! ابھی وہ باہر گئے ہوں گے اور چھوٹی بی بی گھر پر ہوں گی بس......''

''سن رہی ہے نا؟'' رضیہ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

''سن رہی ہوں ماں! تو روتو نہ۔'' زینت نے معصومیت سے ماں کی طرف دیکھا اور اس کے آنسوؤں کو انگلیوں کے پوروں سے روکنے لگی۔

''تُو تو میری اچھی بیٹی ہے نا۔ بس تو جلدی جلدی شام تک سب کمروں کی صفائی کر دے اور کسی سے بات نہ کرنا۔ ٹھیک ہے نا؟ میں صاحب جی کے آنے سے پہلے تجھے لے جاؤں گی۔'' رضیہ نے التجائی نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ ''ٹھیک ہے؟'' اس نے پھر پوچھا۔

زینت نے مسکرا کر اس کو بہلانا چاہا۔ رضیہ نے جھپٹ کر اسے سینے سے لگالیا۔

''میری اچھی بیٹی۔ اکیلے میں گھبرانا مت۔ میں جلد ہی آجاؤں گی۔''

زینت نے ماں کی تسلی کے لیے ایک مرتبہ پھر مسکراہٹ کا حربہ استعمال کیا اور بولی: ''تو جاماں! میں سارا کام فٹافٹ کرلوں گی۔ میں بالکل نہیں گھبراؤں گی۔ تو جا۔'' رضیہ نے پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور آنسوؤں کو سنبھالتی ہوئی پلٹ گئی۔

زینت نے ایک نظر اپنے اردگرد ڈالی اور چکرا کر رہ گئی۔ ایک وسیع سا کمرہ...... یا شاید ہال یا...... اس کے پاس حیرت کدے کے لیے کوئی لفظ نہ تھا۔ کمرے کے عین وسط میں شیشے کی ایک جاذب نظر میز موجود تھی جس پر چند اخبار اور رسالے بکھرے پڑے تھے۔ میز کے گرد مخملی چادروں میں چھپے سیاہ صوفوں کا ایک حصار سا تھا۔ صوفے پر موجود سلوٹیں کسی کے اضطراب کی تشہیر کر رہی تھیں۔ زینت نے آگے بڑھ کر رسالے سمیٹنا چاہے ہی تھے کہ وہ یک دم لڑکھڑا گئی۔ اس کے قدموں تلے ایک چمکیلا سا فرش تھا...... یا شاید ٹھہرا ہو پانی...... اتنا شفاف کہ وہ دیکھ کر ہی پھسلنے لگی۔ اس نے گھبرا کر اپنی جوتی اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ پھر بھی تسلی نہ ہوئی تو اپنی اوڑھنی سے پاؤں کو صاف کرنے لگی۔ پھسلنے کا خوف تو ایک طرف، اسے یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ اس کی ذراسی بے احتیاطی سے یہ ٹھہرا ہوا پانی مضطرب نہ ہو جائے۔ اس نے آرام آرام سے قدم بڑھائے اور بکھرے ہوئے اخبارات اور رسائل کو ترتیب سے میز پر رکھ دیا۔ صوفے کی شکنوں کو برابر کیا اور ہاتھ میں چپل اٹھائے، آنچل سمیٹے، عقیدت سے فرش پر چلنے لگی۔

وہ مرکزی دروازے کی وسعت کو پوری طرح بھول چکی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اب ایسے مناظر تھے کہ وہ انھیں ذہن کے کینوس پر اتار بھی نہ پا رہی تھی۔ اتنے وسیع مناظر!!! ان میں سے ہر ایک منظر اپنے اندر کئی مناظر سمیٹے ہوئے تھا۔ وہ کیا دیکھتی، کیا چھوڑتی، کیا یاد رکھتی اور کیا بھول جاتی، کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ بس گردن گھمائے ہر شے کو دیکھے جارہی تھی۔ اس کے سر پر روشنیوں کا ایک شہر سا تھا، بڑے بڑے فانوس اور برقی بلب۔ وہ یہی سوچ سوچ کر مسکرائے جارہی تھی کہ جب یہ سب روشنیاں ایک ساتھ روشن ہوں تو رات بھی دھوکا کھا جاتی ہوگی۔ وہ سنبھل سنبھل کر ہر زینے پر قدم رکھتی بالائی منزل تک آگئی۔ یہاں سے نیچے ہال کا نظارہ ایک سراب کا سا تھا۔ دائیں

جانب ایک کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ وہ بنا کچھ سوچے اس طرف لپکی اور اس نیم وا دروازے سے اندر جھانکنے لگی۔ کوئی دروازے کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ شاید...... نہیں یہ چھوٹی بی بی جی ہوں گی اماں نے بتایا تھا کہ اس وقت صرف وہی گھر پر ہیں۔

''کون ہے؟'' ایک شیریں آواز نے اسے چونکا دیا اور وہ گھبرا کر دروازے سے اندر آ گری۔

''کون ہو اور کہاں گرتی چلی جا رہی ہو؟'' لبنیٰ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے خفگی سے پوچھا۔

''مم میں میں ہوں بی بی جی!'' زینت نے اپنے وجود کو یوں سمیٹ کر زمین سے اٹھایا جیسے وہ کوئی میلے کپڑوں کی گٹھڑی ہو جو ٹھوکر کھا کر بکھر گئی ہو۔

''تمھیں رضیہ یہاں چھوڑ کر گئی ہے۔؟'' لبنیٰ نے احمقانہ انداز میں اپنے جملے کی تائید چاہی۔

''جی بی بی جی...... اماں چھوڑ گئی ہے۔ وہ کیا ہے نا کہ باجی ہسپتال میں ہیں تو اماں مجھے یہاں چھوڑ گئی ہے کہ آج میں سب کام کر دوں اور وہ مجھے صاحب کے آنے سے پہلے لے جائیں گی۔'' زینت نے معصومیت سے اپنی داستان سنا ڈالی۔

''ہاہاہاہا!'' ایک بے ساختہ قہقہے کی آواز پورے کمرے میں گونجنے لگی۔ زینت کے چہرے پر ایک شرمندگی سی چھا گئی اور وہ مجرم بنی فرش کو گھورنے لگی۔

''اچھا تو ذرا یہ بتاؤ کہ تمھاری امّاں نے یہ کیوں کہا کہ وہ ریحان کے آنے سے پہلے تمھیں لے جائیں گی؟''

زینت کی آنکھوں میں ڈر پنہاں تھا مگر لبنیٰ مسلسل ہنسے جا رہی تھی جیسے کسی شدید کرب سے ابھرنا چاہ رہی ہو۔

''پتا نہیں بی بی جی۔'' زینت اس سے زیادہ کچھ بھی نہ کہہ پائی۔ وہ زمین کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی تھی۔

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔'' لبنیٰ نے سنجیدگی سے بات بدلی۔

''مسرت!'' اس نے مسرت کو آواز دی ہی تھی کہ زینت چونک پڑی۔

''بی بی جی مجھے قسم سے نہیں پتا۔ آپ امّاں سے خود پوچھ لینا۔ مجھے مت مارنا۔ مجھے سب کام آتے ہیں۔ آپ بس حکم کریں بی بی جی! میں کچھ بھی نہیں توڑوں گی......'' زینت نے بے بسی سے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''اوہو۔ میں تمھیں کیوں مارنے لگی۔ عجیب لڑکی ہو۔ مسرت کو بلایا ہے وہ تمھیں کام سمجھا دے گی۔ سمجھی؟''لبنیٰ نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ زینت نے اپنی حماقت تسلیم کرلی۔

کچھ ہی دیر میں ایک ادھیڑ عمر خاتون کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ کسی سوکھے ہوئے درخت کی طرح بالکل سپاٹ تھا۔

وہ زینت کو دیکھتے ہی اپنا کام سمجھ گئی۔ وہ ایسے حالات کی عادی تھی۔ اس کو اب یاد بھی نہ تھا کہ اس گھر میں اب تک کتنے نوکر آئے اور کتنے چلے گئے۔

''مسرت اس کو کوئی چھوٹا موٹا سا کام دے دو، چھوٹی سی تو ہے بیچاری'' زینت اس رعایت سے مرعوب تو ہوگئی مگر اس کی سمجھ یہ نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔ شکریہ کہنا شاید اسے مناسب نہ لگا اور وہ سر جھکائے مسرت کے پیچھے پیچھے چل دی۔

''زینت جب کام کرلو تو میرے کمرے میں آجانا مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''لبنیٰ کی اس بات پر اس نے سر ہلانے پر اکتفا کیا اور مسرت کے پیچھے پیچھے چل دی۔ لبنیٰ نے دروازہ بند کرلیا اور وہی پہلے والی خاموشی اوڑھے بستر پر گر گئی۔ رات سے اب تک اس نے کسی سے کوئی بات نہ کی تھی۔

نہ جانے زینت کے لیے ہمدردی کہاں سے امڈ آئی، وہ خود بھی حیران تھی۔ ریحان بھی صبح سے غائب تھے ورنہ اتنی بڑی پارٹی تھی کل...... وہ تو کئی کئی روز آرام کرنے والوں میں سے تھے۔ شاید...... وہ کچھ سوچ کر خود ہی سہم گئی۔ پھر اچانک بیڈ سے اٹھی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔

''ایک رات میں چہرہ کتنا مرجھا گیا ہے...... میں تو ایسی نہیں ہوں...... کیوں کسی کے لیے خود کو ہلکان کیے جا رہی ہوں۔'' پھر وہ کافی دیر تک مصنوعی رنگ میں رنگتی رہی۔ چہرے کو عمدگی سے نکھارا اور بال سنوارنے لگی مگر پھر بھی کچھ کمی سی تھی۔ اک خلش تھی جو پر نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے رنگین تہوں میں مسز ریحان کو چھپانے کی بہت کوشش کی مگر پھر بھی بات بنتی نظر نہ آئی تو بستر پر جا گری۔

ظالم اور مظلوم بھی اس قرب سے نہ گذرتے ہوں گے جس ظلم سے وہ عینی شاہد گذرتا ہے جس کے ضمیر میں

بیداری کی رمق باقی ہو۔ جدّت کا نقاب بھی عورت کو نہیں چھپا سکتا۔ وہ بہت دیر تک مسز ریحان کو جدّت کا نقاب دے کر سلاتی رہی پر آج اس کا ہر حربہ بے سود ثابت ہو رہا تھا۔ وہ خود سے الجھ کر تھک چکی تھی۔ بالآخر مسرت کو آواز دی جو اگلے ہی لمحے اس صدا پر لبیک کہتی ہوئی اس کے سامنے حاضر تھی۔

''جا کر زینت کو بلا لاؤ اور اس کا کام کسی اور سے کروالو۔ جاؤ جلدی جاؤ۔'' اس کے ذہن کا سارا زہر اس کے لہجے میں اتر چکا تھا۔ مسرت کو اس طرح کے رویوں کی عادت سی ہوگئی تھی۔ وہ بغیر کچھ کہے کمرے سے چلی گئی اور کچھ ہی دیر میں زینت کا بازو پکڑے لبنیٰ کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ لبنیٰ نے ایک زہر آلود نگاہ مسرت پر ڈال کر اُسے واپس جانے کا کہا۔ اس نے زینت کا بازو اپنی گرفت سے آزاد کیا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ دروازہ بند ہوتے ہی لبنیٰ کے چہرے پر پریشانی کے بادل چھا گئے گویا مسرت اس کا سارا زہر اپنے ساتھ لے گئی ہو۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے زینت کو پاس بلایا اور بیٹھنے کا کہا۔ وہ بھی ازلی غلامی کا بوجھ لیے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''صغریٰ کیوں نہیں آئی آج؟'' لبنیٰ نے بات شروع کی۔

''وہ...... بی بی جی......''

''ہاں، بولو نا!''

''امّاں نے بتانے سے منع کیا ہے کہ آپا ہسپتال میں ہیں۔'' زینت نے اپنے بھولپن کی وجہ سے اصل بات اُگل دی تو لبنیٰ بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

''یہ سادگی تو لے ڈوبتی ہے انھیں۔'' لبنیٰ نے سوچا۔

اچھا ٹھیک ہے مت بتاؤ، مگر اتنا بتا دو اسے ہوا کیا ہے؟ ٹھیک تو ہے نا؟'' لبنیٰ نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

زینت نے رازدارانہ لہجے میں اسے مخاطب کیا: ''بی بی جی! دراصل وہ......'' لبنیٰ کے اندر ایک طوفان سا اٹھ آیا اور وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ زینت نے اسے متوجہ پا کر بات جاری رکھی۔ ''کل ایک کوٹھی میں بڑی دعوت تھی۔ آپا بولی وہ دیر سے آئے گی۔'' لبنیٰ ایک پل کے لیے ٹھٹھک گئی۔

''کیا تمھیں پتا ہے کون سی کوٹھی میں؟''اس کی آنکھوں میں ایک امید سی ابھری۔

''نہیں میں تو گھر پر ہی ہوتی ہوں نا، بی بی جی! آپا اور اماں کام پر جاتی ہیں۔''لبنیٰ کو جواب مل چکا تھا۔اس نے زینت کی بات کاٹی اور پھر سے مدّعا پر آ گئی۔

''اچھا ٹھیک ہے......تم صغریٰ کا بتا رہی تھی۔''اس کا احساسِ جرم مزید گہرا ہوتا گیا۔زینت کو کچھ بھی سمجھ نہ آیا اس نے پھر سے بات شروع کر دی،''رات کو وہ امّاں سے بھی پہلے آ گئی پر......''

''پر......کیا؟ بولو زینت!''لبنیٰ کی بے چینی بڑھنے لگی۔اسے ایک بے نام سے احساس نے جکڑ لیا۔''پر آپا کو کسی نے بہت مارا تھا۔اس کے سر سے بھی خون بہہ رہا تھا۔کپڑے بھی پھٹے ہوئے تھے۔وہ تو روئے جا رہی تھی۔اسے درد ہو رہا تھا نا۔وہ بھاگ بھاگ کر آئی تھی اور بی بی جی وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔'' زینت کی آنکھوں میں ایک خوف سا تیرنے لگا۔لبنیٰ دم سادھے بیٹھے اس کی بات سنتی رہی۔

''پھر آپا نے مجھے ماچس لانے کو کہا۔وہ زور زور سے کانپ رہی تھی۔میں بھاگ کر ماچس لے آئی۔پر آپا سے ایک گندی سی بدبو آ رہی تھی۔میں نے پوچھا کہ کیا ہوا۔''

''تو اس نے بتایا تمھیں کہ کیا ہوا......بولو؟''اس کی روح کی لغزش اس کے کانپتے لفظوں سے ظاہر ہو رہی تھی۔

''ہاں بی بی جی! وہ بولی کہ اس سے کوئی مہنگی چیز ٹوٹ گئی تھی۔مالک نے اسے بہت مارا اور اس لیے وہ بھاگ کر آ گئی۔پھر آپا نے مجھے کمرے سے باہر نکال دیا اور کہا کہ اماں کو کچھ نہ بتاؤں۔مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا بی بی جی تب ہی اس نے ماچس سے خود کو آگ لگا لی۔اب وہ آرام سے ہسپتال میں ہے۔اسے کام بھی نہیں کرنا پڑے گا اور کوئی مارے گا بھی نہیں......''

زینت بولتی چلی گئی اور لبنیٰ پر جیسے قیامت آ گری تھی۔وہ وہیں ساکن بیٹھی رہ گئی۔اس کی آنکھوں کے سامنے کل کا منظر کسی فلم کی طرح چلنے لگا۔صغریٰ کانچ کے ٹکڑوں کی طرح اس کے سامنے بکھری پڑی تھی۔اب وہ لبنیٰ اور مسز ریحان کی بندشوں سے آزاد صرف ایک عورت بن چکی تھی۔ایک کمزور اور بے بس عورت۔اس نے ہاتھ آگے

بڑھایا جیسے کچھ پکڑنا چاہتی تھی۔

''بی بی جی!'' زینت نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہا۔ہا۔ہاں......''

''آپ کس کو پکڑ رہی ہیں؟'' زینت نے اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''صغریٰ کو......'' اس کی زبان سے بے اختیار نکل پڑا۔

''پر آپی تو ہسپتال میں سو رہی ہیں۔'' زینت نے اپنے طور پر لبنٰی کی اصلاح کرنا چاہی۔ لبنٰی اس وقت خود سے جنگ ہار چکی تھی اور ایک مجرم کی طرح اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''اگر تمھیں پتہ چل جائے کہ کس نے صغریٰ کو مارا ہے تو کیا کرو گی؟'' لبنٰی نے سزا کا اختیار زینت کو سونپتے ہوئے کہا۔

''مم میں......میں اسے کچھ بھی نہیں کہوں گی، غلطی آپا کی تھی نا۔ کوئی میری گڑیا توڑ دے تو میں بھی اسے ماروں گی۔'' اس کے جواب میں ایک اطمینان سا تھا۔ ''مطلب سامان بھی بڑا قیمتی ہوتا ہے نا!''

''تو کیا صغریٰ قیمتی نہیں تھی؟'' لبنٰی نے نظریں اس کے چہرے پر جمائے رکھیں۔

''آپا......وہ کیوں قیمتی ہوگی......وہ تو ایک لڑکی تھی۔''

زینت کے الفاظ نے اس کی روح کو چھلنی کر دیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور وجود ایک بھٹی کی طرح دہک رہا تھا جس میں اس کی ساری جدّت، بناؤ سنگھار اور غرور خاک میں مل گیا۔

دروازے پر کب سے دستک ہو رہی تھی۔

''آجاؤ۔'' اس نے خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے کہا

''رضیہ زینت کو لینے آئی ہے'' مسرت نے غلامانہ انداز میں کہا۔

''شام ہوگئی ہے کیا؟'' اس نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''شام تو نہیں ہوئی......وہ کہہ رہی ہے اب وہ کام پر نہیں آیا کرے گی، اس لیے زینت کو بھی لینے آئی ہے۔''

مسرت نے بات مکمل کر کے پھر سے سر جھکا لیا۔

''اسے بلا کر لاؤ۔''، لبنیٰ اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑی ہوگئی اور چہرے سے جرم کے سب چھینٹے پونچھ ڈالے۔ زینت ایک خاموش سامع کی طرح سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں رضیہ کمرے میں موجود تھی۔ اس کی آنکھوں میں نفرت تھی، جلال تھا، وہ پہلے والی رضیہ نہیں تھی جو سر جھکائے اس کے سامنے آیا کرتی تھی۔ کوئی اور تھی ......ایک زخمی شیرنی ......ایک مظلوم عورت ......ایک ماں ......لبنیٰ نے نہایت اطمینان کے ساتھ بات شروع کرنا چاہی۔

''ابھی اس نے کام بھی نہیں کیا اور تم لینے بھی چلی آئی ہو؟''

''اب یہ یہاں کام نہیں کرے گی۔ ایک بیٹی گنوا چکی ہوں، دوسری گنوانے کا حوصلہ نہیں ہے، بی بی جی! جانے دیجیے۔'' رضیہ کی آواز کی شکایت نے پھر اسے اس کے جرم کا احساس دلایا۔

''کیا ہوا صغریٰ کو؟'' اس نے بمشکل الفاظ کو جوڑا تھا۔

''مر گئی ہے وہ......'' یہ تین الفاظ پوری بات سمجھنے کو کافی تھے۔ رضیہ نے زینت کا بازو پکڑا اور باہر نکل گئی۔

کھلی کشادہ سیڑھیاں، روشن فانوس، مخملی صوفے، صاف شفاف فرش، وسیع ہال......سب اپنی جگہ تھا۔ رضیہ کا زینت کا بازو کھینچے چلے جانا......وہی آنکھوں میں آنسو......وہی مناظر......وہی کردار مگر......حالات بدل چکے تھے۔ ابھی اس نے دہلیز بھی پار نہ کی تھی کہ ریحان ہاتھ میں کوٹ اٹھائے منہ میں سگریٹ دبائے لمبے لمبے کش لیتا اندر داخل ہوا اور حقارت بھری نگاہوں سے ماں بیٹی کو دیکھنے لگا۔ رضیہ نے ہاتھ بڑھا کے زینت کو گھسیٹا اور اپنی اوٹ میں چھپا لیا اور ایک زہریلی نگاہ ریحان کے چہرے پر پیوست کر دی۔

ریحان نے خفیف سی مسکراہٹ سے اس کا سارا زہر زائل کر دیا اور دھوئیں کے بادل بناتا اندر چلا گیا۔ رضیہ نے زینت کو چادر میں چھپایا اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے باہر کو چل دی۔

''ہاہاہا......'' اس کے قہقہوں سے پورا ہال گونجنے لگا۔ لبنیٰ اب تک ان تین لفظوں کی گہرائی میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے خود کو اتنا کمزور کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ صغریٰ نے اپنی تمام تر مجبوریوں کے باوجود اپنی عصمت کا پاس

رکھا۔ زینت بھی اپنی سادگی میں کامل ہے۔ رضیہ بھی اپنے بچوں کو شکاری کے پنجوں سے چھڑانے کا ہنر جانتی ہے۔ لیکن میں ......ایک زندگی میری آنکھوں کے سامنے برباد ہوئی ......میرا گھر میرے سامنے بکھرا اور میں ......لڑنا تو دور یہ حقیقت تسلیم کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتی ......کیا ہوں میں ......؟ سجے سنورے گھر کا ایک آرائشی حصہ ......؟ بے کار جز ......؟ ریحان قاتل ہے اور میں گواہ ہوں ......تو کیا میں اسے اب بھی سزا نہیں دلوا پاؤں گی ......کیا میں بھی اس کے گناہوں کی ذمّہ دار بن کر رہ جاؤں گی ......صغریٰ ......میں چاہتی تو اسے بچا سکتی تھی ......کیا میں بھی قاتل ہوں؟

اس کا دل اس تیزی سے دھڑکنے لگا جیسے آج ہی اپنے مقدّر کی سب دھڑکنیں پوری کر کے دم لے گا۔

''لبنیٰ ارے بھئی تمھارے مجازی خدا آئے ہیں کم از کم چائے ہی پلا دو۔'' ریحان نے شوخ لہجے میں اسے آواز دی اور خود صوفے پر براجمان ہو کر سگریٹ سلگانے لگا۔ لبنیٰ کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

''لبنیٰ! چائے!'' اس نے ایک بار پھر آواز دی۔

''میں چائے لا دوں صاحب۔'' مسرت جو تب سے یہ سب کچھ سن رہی تھی، بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''نہیں رہنے دو! چائے تو ہم اپنی بیوی کے ہاتھ کی پئیں گے۔'' ریحان نے لہجے کی شوخی کو برقرار رکھا۔

تھوڑی دیر میں لبنیٰ سیاہ رنگ کا سوٹ پہنے سنگھار کیے سیڑھیاں اترتی ہوئی اس کے سامنے موجود تھی۔ اس نے اشارے سے مسرت کو جانے کا کہا۔

''ہائے! ایک ہی تو خواہش ہے میری۔ بس چائے اپنے ہاتھوں سے بنا کر پلایا کرو۔ آج تو وہ بھی خطرے میں الگ رہی ہے۔'' ریحان نے شرارتاً اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کی خواہش کتنی قیمتی ہے، اس کا تو خود آپ کو بھی اندازہ نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چل دی۔

''تمھاری یہی ادا تو پسند ہے ......ہاہاہا ......ہاہاہا......'' سارا ہال اس کے قہقہوں کی لپیٹ میں آ گیا۔

(حافظ محمد عمیر مظہر لمز کے طالب علم ہیں)

ذیشان دانش خان

بلاعنوان

دوپہر کا وقت تھا۔ وہ دفتر سے چھٹی کر کے بس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ دھوپ، گرمی اور شدید حبس کے موسم میں اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ دھوپ میں کھڑا رہنے کی وجہ سے وہ پسینے میں شرابور تھا۔ یہ کوئی آج کی بات نہ تھی بلکہ آئے روز کا معمول تھا۔ اس کا گھر دفتر سے کافی دور تھا۔ اس لیے اسے روزانہ بسوں اور ویگنوں کے دھکے کھانے پڑتے تھے اور وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اپنی قلیل سی تنخواہ میں اس کے گھر کا چولھا بھی مشکل سے جلتا تھا کجا یہ کہ وہ سائیکل یا موٹر سائیکل خریدتا اور اس کے اخراجات برداشت کرتا۔ خدا خدا کر کے ایک ویگن رکی اور اس میں اسے بمشکل کھڑے ہونے کی جگہ ملی۔ وہ سارے راستے کمر جھکائے کھڑا رہا۔ گویا اسکول میں استاد نے سزا دے رکھی ہے۔

وہ میرے گھر کے قریب ہی رہتا تھا اور اکثر اوقات مجھے پریشان ہی نظر آتا تھا۔ شام کے وقت جب وہ گلی کے نکڑ پر کھڑا تھا تو میں نے پوچھ ہی لیا۔ ''بھائی ارشد! کیا حال چال ہیں؟''۔

''اللہ کا شکر ہے۔ آپ سنائیں''۔ اس نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔

''بھائی خیر تو ہے آپ بہت پریشان دکھائی دے رہے ہیں'' میں نے پوچھا۔

''بس یار مت پوچھو! پچھلے ایک ہفتے سے میری امی جان سخت بیمار ہیں اور سرکاری ہسپتال میں داخل ہیں''۔

اس نے افسردہ سے لہجے میں جواب دیا گویا اب رو دے گا۔

''اللہ پر بھروسہ کرو۔ اللہ انھیں صحت عطا فرمائے (آمین)'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی گذر بسر اچھی طرح نہ ہوتی تھی۔ اس کے پاس اپنی ماں کے علاج معالجے کے لیے بھی پیسے نہ تھے۔ وہ معاشرے کی ناانصافیوں اور ناہمواریوں سے بہت تنگ تھا۔ وہ کہہ رہا تھا اس دنیا میں کس قدر ناانصافی ہے کسی کے پاس اتنا ہے کہ اس کی دولت کئی نسلوں کے لیے کافی ہے اور کسی کے پاس دس تاریخ کے بعد جیب میں پیسے نہیں ہوتے یہاں تک کہ وہ اپنی ماں کے لیے دوا لے سکے۔ ایک طرف لوگوں کے بچے ائیر کنڈیشنڈ اسکولوں میں پڑھتے ہیں، اور دوسری طرف بچوں کے لیے ٹاٹ والے سکول بھی میسر نہیں۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جو ہر سال نئے ماڈل کی کار خریدتا ہے جب کہ دوسرے طبقے کے پاس کھانے کے لیے دو وقت کی روٹی بھی نہیں۔ اگر کچھ ہے تو صرف غربت وافلاس، بھوک ونگ، بے روزگاری اور جہالت۔ کیا غریب کو اسی لیے پیدا کیا گیا ہے کہ سسک سسک کر زندگی گذار دے۔

میں نے اسے تسلی دی کہ انسان کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور کبھی بھی ہمت نہیں ہارنی چاہیے بلکہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے اور صبر وشکر سے زندگی گذارنی چاہیے۔

اس کے پاس تھوڑی دیر کھڑا رہنے کے بعد میں واپس چلا آیا۔

کچھ دن اسی طرح گذر گئے۔ جب کبھی وہ میرے پاس آتا، اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا۔ لیکن پچھلے تین چار دنوں سے میری اس سے ملاقات نہ ہوسکی کیونکہ میں آج کل اپنے امتحانوں کی تیاری میں مصروف تھا۔

آج اچانک وہ مجھے بس سٹاپ پر مل گیا میں نے پوچھا ''کہاں جا رہے ہو؟''

کہنے لگا ''اپنی امی جان کو خون دینے ہسپتال جا رہا ہوں انھیں خون کی سخت ضرورت ہے''۔

''میں بھی چلوں تمھارے ساتھ؟''۔ میں نے کہا۔

''نہیں۔ بہت شکریہ! اللہ آپ کو اجر دے''۔

اس نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے میری ویگن مل گئی اور میں اس میں بیٹھ کر چلا گیا۔ آج مجھے شہر سے باہر کسی کام سے جانا تھا۔ میرا ذہن اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی حالت واقعی قابل رحم تھی۔ جب سے اس کے والد فوت ہوئے

تھے، گھر کی ساری ذمہ داری اس کے کندھوں پر آ پڑی تھی۔ وہ اپنی ماں سے بہت پیار کرتا تھا۔ شاید اسی لیے اب تک زندگی سے لڑ رہا تھا۔

شام کو جب میں واپس آیا تو اس کے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ گھر والے رو پیٹ رہے تھے۔ مجھے یکدم دھچکا سا لگا۔ میں نے گھر کے باہر جمع لوگوں سے پوچھا ''کیا ہوا''۔

''ارشد صاحب کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے''۔ کسی نے جواب دیا۔

اتنے میں ارشد پر میری نظر پڑی۔ وہ آگے بڑھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''ماں اپنی اولاد کے لیے سایہ دار درخت کی طرح ہوتی ہے اور آج میں اس سائے سے محروم ہو گیا ہوں''۔

''ہوا کیا تھا''۔ میں نے اسے تسلی دینے کے انداز میں پوچھا۔

''میری ماں خون نہ ملنے کی وجہ سے اس دنیا سے رخصت ہو گئی''۔

''لیکن تم تو آج صبح خون دینے ہسپتال جا رہے تھے''۔

''ہاں — ویگن دیر سے آنے کی وجہ سے میں وقت پر ہسپتال نہ پہنچ سکا تھا'' اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

(ذیشان دانش خان لمز میں ریسرچ ایسوسی ایٹ ہیں)

حارث بلال

غزل

وہ درمیان سے نکلا تو یہ کُھلا مجھ پر
کہ ہو گئے ہیں مُسلّط کئی خدا مجھ پر

ادھورے نقش وگرنہ کشش نہیں رکھتے
کیا گیا ہے کوئی خاص تجربہ مجھ پر

ہمارے بیچ تکلم کی ایک صورت تھی
کہ حُسن تجھ پہ اُترتا اور آئنہ مجھ پر

بٹھا دیا گیا پہلے بڑے بڑوں میں مجھے
پھر ایک کیمرہ فوکس کیا گیا مجھ پر

وہ چاند ہے، اُسے زیبا ہے داغ ماتھے پر
میں راستہ ہوں سو پڑتا ہے نقشِ پا مجھ پر

میں اِس ادا سے درختوں کے بیچ ٹھہرا رہا
کہ ایک روز کوئی نام لکھ گیا مجھ پر

(حارث بلال لمز کے طالب علم ہیں)

حارث بلال

غزل

کہاں کہاں کوئی دیوار تھی نظر رکھنا
بھلے ہماری کہانی کو مختصر رکھنا

کیا گیا ہے کوئی سانس لینے پر مامور
کسی کے ذمے لگا ہے تری خبر رکھنا

میں چاہتا ہوں کسی کی نظر کی ہمسفری
مرے خدا! مرے رستے کو پُر خطر رکھنا

کسی سے پہلے میں اپنا فسانہ خود کہہ لوں
کسی سے ہو گا نہیں تجھ کو معتبر رکھنا

کٹے ہوؤں میں بہت سے جھکے ہوئے سر تھے
ہر ایک کو نہیں نیزے کی نوک پر رکھنا

(حارث بلال لمز کے طالب علم ہیں)

سردار علی حسن

غزل

صبر کے پیروں میں چھالے، راستے، بے تاب دن
ساتھ میرے چل رہے ہیں حوصلے، بے تاب دن

چھین کر آنکھیں ہماری لُوٹ کر چہرے کے رنگ
سامنے کس نے رکھے ہیں آئینے، بے تاب دن

مَیں تمھارے جسم کو چھُونے سے پتھر ہو گیا
اور میرے جسم پر چلتے رہے بے تاب دن

کون سا غم ناچتا ہے اِس دلِ پُر سوز میں
کون تھا جو دے گیا ہے فاصلے، بے تاب دن

خشک پتے تھے ہوا کا ساتھ جو دیتے رہے
سوچ کے اِس پیڑ پر بیٹھے رہے بے تاب دن

سرد موسم میں ہوائیں گرم کیوں چلتی ہیں اب
چھوڑ کر مجھ کو تو کب کے جا چکے بے تاب دن

تیرگی کِس ہاتھ میں ہے روشنی کِس ہاتھ میں
ہاتھ بانہوں میں چھپا کر آ گئے بے تاب دن

کِن حسیں آنکھوں سے الجھی آنکھ تیری اے علی
کِس محبت نے تجھے یہ دے دیے بے تاب دن

(سردار علی حسن لمز میں ریسرچ اسسٹنٹ ہیں)

محمد علی اشرف

غزل

تھکے ہیں پاؤں اور اب جھکی ہے نظر
یہ کس مقام پہ لایا مجھے وفا کا سفر

یہ روشنی مجھے جینے کا درس دیتی ہے
جلا کے یوں ہی چراغوں میں میرا خونِ جگر

چھپائے بیٹھا ہے اُس کو بھی کوئی پلکوں تلے
وہ اک نگاہ جسے ڈھونڈتی ہے سب کی نظر

میں آپ اپنی حقیقت سے آشنا ہی نہیں
کوئی تو مجھ کو دلاؤ خدارا میری خبر

میں جل ہی جاؤں گا اپنی انا کے شعلوں میں
مرے وجود کا مجھ پر ہے بے تحاشا اثر

ہوا کے شور کو للکار کر بلاتی ہے
وہ شمع جس میں چمکتی ہو زندگی کی لہر

(محمد علی اشرف لمز کے طالب علم ہیں)

وکش اویس

غزل

ان ملاقاتوں میں آخر، شوقِ حسرت کیوں نہیں؟
بے قراری دل میں جو تھی، اب وہ حالت کیوں نہیں؟

جس کو پانے کے لیے میں منزلوں سے مڑ گیا
اس زمیں سے اب مجھے کوئی عقیدت کیوں نہیں؟

آسمانوں میں جو میری خواہشوں کے پیڑ تھے
ان درختوں سے مجھے اب پھل کی چاہت کیوں نہیں؟

ہار میں تو ہار ہے، اس جیت میں بھی ہار ہے
سوچتا ہوں ہاتھ میں انساں کے قسمت کیوں نہیں؟

کر کے دعویٰ عشق کا منصور سولی چڑھ گیا
دیکھنے والوں نے سمجھی وہ حقیقت کیوں نہیں؟

(وکش اویس لمز کے طالب علم ہیں)

عبدالوہاب نیاز

''میں'' کی صدا

آنکھوں میں نمی سی
دِل میں کمی سی
پھول میں خوشبو سی
ہاتھ آتی نہیں
مبہم ہے وہ ''کہیں'' سے
شکستہ ہے یہ ''نہیں'' سے
دِل شکستہ ہے اب بے آواز
آواز آ رہی ہے
محسوس ہو رہی ہے
نمو ہو رہی ہے

مضطرب ہے روح اب بھی
سوال پوچھ رہی ہے
جواب ڈھونڈ رہی ہے
پھولوں کی بو میں
''لا'' میں اور ''ما'' میں
''نہاں'' میں اور ''عیاں'' میں

بلبل کی صدا میں
صبح کی ہوا میں

اِس میں بھی ہے اک صدا
صدا میں بھی ہے اک نوا
کرچیوں میں ہے میرا بیاں
مضبوطی کا ہے یہ نشان
تعمیر کی ہے یہ صدا
وجود کی ہے یہ نوا
وہم ہو رہا ہے
گماں روک رہا ہے
نہاں ٹوک رہا ہے
شعور سوچ رہا ہے

حروف مل رہے ہیں، الفاظ بن رہے ہیں
الفاظ مل رہے ہیں، صدا بن رہی ہے
اعلان کر رہی ہے
''نہاں'' میں! ''عیاں'' میں!
''لا'' میں! ''ما'' میں!
ہر سو ہے تو!
ہر سو ہے تو!

(عبدالوہاب نیازلمز کے طالب علم ہیں)

اسداللہ خان

حرف، معانی اور ذات

الفاظ پگھل رہے ہیں
اور معانی قلعۂ زبان سے آزادی کا پروانہ لے کر
وصالِ ذات کے منتظر ہیں۔
احساس کی بوندیں
معانی کے بے کراں سمندر میں
اپنا وجود کھوتی جا رہی ہیں
اور یہ سمندر
وجود کی لاانتہا وسعتوں کو
اپنے دامن میں سمیٹ لینے کو بے تاب ہے۔
مگر وجود اور ذات کے اس جھگڑے میں
شناخت مٹ رہی ہے۔
وقت گھٹتا اور مکان سمٹتا جا رہا ہے۔
معانی کا بہاؤ
ذات کا احاطہ کیے ہوئے ہے، مگر
ذات معنویت کو دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے۔
قلعۂ وجود کی دیوار مسمار ہونے کو ہے، مگر
الفاظ کے گھروندے سے معانی کا گارا

رس رس کر
ذات کوتقویت بخش رہا ہے۔
شخص گھل رہا ہے
شناخت مٹ رہی ہے۔
اس دوران معانی الفاظ کے خون سے اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔
ان کا دام
سمٹتے سمٹتے
وجود کا گلا گھونٹ رہا ہے۔
اب وجود معانی کی خوراک بن چکا ہے۔
احساس، زبان، شخص، وجود......
سب ہوا میں تحلیل ہو کر
معانی کی چکّی میں پس رہے ہیں۔
وجود مٹ چکا ہے، مگر ذات
معانی در معانی اُگل رہی ہے۔
شام ڈھل رہی ہے۔
اندھیرا روشنی کو کھا کر نیا سویرا اُگل رہا ہے، اور
دن ڈھل رہا ہے۔
......پہیّہ چل رہا ہے۔
...... پہیّہ چل رہا ہے۔

(اسداللہ خان لمز کے طالب علم ہیں)

ربیکا ہڈا نک راچ

پاکستان: میرا تجربہ

[خزاں (Fall) سمیسٹر ۲۰۱۶ء میں اسٹوڈنٹس ایکسچینج پروگرام (Students Exchange Program) کے تحت جرمن طلبہ و طالبات کا ایک گروپ لمز آیا۔ اُن میں سے ایم اے (ماسٹرز) کی ایک طالبہ ربیکا نے اُردو زبان سیکھنے کے لیے اُردو زبان کا ایک کورس The Art of Reading and Writing Urdu لیا اور پورے ذوق وشوق سے اُردو زبان سیکھی اگرچہ وہ پہلے بھی اُردو زبان کسی حد تک سیکھ چکی تھیں لیکن لمز میں انھوں نے اُردو زبان پر مہارت حاصل کرنے کے لیے سخت محنت کی اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی رہیں۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ربیکا نے پاکستان کے متعلق اپنے تجربات اور تاثرات کو اُردو میں قلم بند کیا جو ''پاکستان: میرا تجربہ'' کے عنوان سے آپ کے سامنے ہے۔]

سولہ دسمبر دو ہزار چودہ ...... پشاور: ایک سو اڑتالیس افراد ہلاک زیادہ تر بچے۔

ستائیس مارچ دو ہزار سولہ ...... لاہور: تین سو چالیس لوگ زخمی اور پچھتر لوگ ہلاک۔

جب یہ واقعات میری نظر میں آئے، اس وقت تک میرا پاکستان جانے کا منصوبہ طے ہو چکا تھا۔ اور یہی وہ وقت تھا جب میرا یہ دعویٰ کہ پاکستان میں حملے ہوتے تو ہیں لیکن لاہور میں نہیں، کے غلط ہونے کا ثبوت سامنے آ گیا تھا۔ ستائیس مارچ دو ہزار سولہ کو لاہور میں ہونے والے اس دہشت گردی کے حملے نے میرے دعوے کو کمزور اور جھوٹا ثابت کر دیا تھا۔ اس سب کے دوران آٹھ اگست دو ہزار سولہ کو کوئٹہ میں وکلا پر ہونے والے حملے میں ستر وکلا کی ہلاکت اور ایک سو تیس افراد کی زخمی حالت نے ایک نئی رکاوٹ کو جنم دیا۔ لیکن اس وقت تک پاکستان جانے کی تیاریاں تقریباً مکمل ہو چکی تھیں اور میری خالہ مجھے پاگل قرار دے چکی تھیں۔ پاکستان کیوں جانا چاہتی ہو؟ تم ہندوستان تو جا چکی ہو۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟ پاکستان میں ایسا کیا ہے جو تمھارے لیے دیکھنا اتنا ضروری ہے کہ تم اپنی جان خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہو؟ اس وقت میرے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مگر اب، اس خطرناک ملک میں رہنے کے

بعد، میرے پاس جواب ہے اور یہ میں آپ کو اس مضمون میں بتانے جا رہی ہوں۔

لاہور میں جو میرے پانچ مہینے تھے، وہ اتنے اچھے گذرے کہ بیان کرنا ہی مشکل ہے۔ لاہور کی تاریخی عمارتیں، اندرون شہر کی رونق، انارکلی کی حلوہ پوری، غلیظ ترین جگہوں کے دہی بھلے، لکشمی چوک کی کشمیری چائے، مبارک حویلی میں خطاطی سیکھنا، مسجد وزیر خان میں جمعہ کی اذان سننا اور اس کے علاوہ بہت سی یادیں جو الفاظ میں ڈھالنا مشکل ہے۔ میں بس اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ میرا وقت بہت اچھا گذرا! نہ صرف میرا وقت اچھا گذرا، بلکہ میں خوش بھی تھی۔ شاید اس ملک کی سب سے اہم خاصیت کی وجہ سے جو کہ پاکستان کی مہمان نوازی ہے۔ جب آپ کسی دوسرے ملک جاتے ہیں تو عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ ایک اچھا تجربہ حاصل ہوتا ہے، لوگ شائستگی سے پیش آتے ہیں لیکن گھر کا احساس نہیں ہوتا۔ کیونکہ گھر ہوتا ہی نہیں ہے اور لوگ آپ کے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔ مگر پاکستان میں مجھے گھر کا احساس ہوا۔ لوگ نہ صرف اچھے اور دلبر ہیں، بلکہ انھوں نے مجھے اتنا پیار دیا اور مجھے، ایک اجنبی کو، اپنی اولاد کی طرح اپنایا کہ مجھے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس ہی نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ اپنے گھر اور اپنے ماں باپ کی بھی نہیں۔

لاہور میں میری سہیلی کی امی مجھے ساتھ ایک بستر پر سلاتی تھیں۔ میرا بہت خیال رکھتی تھیں اور سب سے پہلے میرے لیے اور میری خوشی کے لیے سوچتی تھیں۔ اس کے مقابلے میں جرمنی میں تو مہمان نوازی کا تصور ہی نہیں ہے۔ جب مہمان آتے ہیں تو ہاں، انھیں کچھ کھلاتے ہیں، ان کی خدمت کرتے ہیں۔ لیکن وہ کچھ دنوں کے لیے آتے ہیں، پانچ مہینوں کے لیے تو نہیں! میں کبھی سوچ ہی نہیں سکتی کہ میری ماں میری کسی سہیلی کو اپنے بستر پر سلاتیں، اپنا پورا معمول اس کے لیے بدلتیں اور اس کو اپنی بیٹی جیسے اپناتیں۔ شاید وہ یہاں، ہندوستان اور پاکستان میں ہی ممکن ہے۔ شاید اس لیے مجھے پاکستان اتنا اچھا لگا۔

میں نے دیکھا کہ پاکستان کے معاشرے میں لوگ ایک دوسرے کا بھی بہت خیال رکھتے ہیں۔ وہ اپنے پڑوسیوں سے اچھا رویہ رکھتے ہیں اور ضرورت ہونے پر ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ چاہے ان کی صورتحال خود کتنی ہی مشکل کیوں نہ ہو، چاہے ان کا ہاتھ خود کتنا تنگ کیوں نہ ہو۔ پاکستان کے معاشرے کی اس خصوصیت کی میں انتہائی عزت کرتی ہوں۔ اس ضمن میں مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ کبھی کبھی لوگ دوسروں کی زندگی میں کچھ زیادہ جھانک لیتے ہیں،

کچھ زیادہ جاننا چاہتے ہیں اور پھر ان کے پیچھے باتیں کرتے ہیں۔ یہ چیز ہمیں قید کر دیتی ہے کیونکہ ہم ہر وقت یہ سوچتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ہم لوگوں کی رائے کے محتاج ہیں اور اس وجہ سے میں نے پاکستان میں اتنی آزادی محسوس نہیں کی جتنی جرمنی میں ہوتی ہے۔ مثلاً میں سڑک پر سائیکل چلا سکتی ہوں، جو پاکستان میں ممکن ہی نہیں ہے...... کیونکہ لوگ کیا کہیں گے؟ میں سوچتی ہوں کہ جب تک ہم خود کو دوسروں کی رائے سے رہا نہیں کرتے تب تک ہم ترقی نہیں کر سکتے۔ اگر میں دوسروں کی رائے کی محتاج ہوتی تو میں پاکستان نہ آتی۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہم خود بھی ہمیشہ دوسروں پر رائے دیتے ہیں اور ان کے پیچھے کچھ بولتے ہیں۔ میں بھی کرتی ہوں۔ مگر میں کیوں کروں؟ چاہے کسی نے اپنے بالوں کو کوئی عجیب رنگ دیا ہو، چاہے کوئی ہم جنس پرست ہو یا غیر مذہبی۔ ان کے اپنے فیصلے ہیں، ان کی زندگی ہے، انھیں جینے دیں۔ شاید وہ اپنی جگہ پر صحیح ہیں، شاید وہ ہم سے بہتر انسان ہیں۔ ہمیں دوسروں پر رائے دینے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک لینا چاہیے۔ جیسا کہ میں ابھی پاکستان کے معاشرے کا تجزیہ کر رہی ہوں ویسے ہی مجھے اپنے ملک کو بھی دیکھنا چاہیے۔

پاکستان کے معاشرے کے اس رویے کا ایک نتیجہ اور بھی ہے۔ جب لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے انھیں دیکھ کر ایک رائے قائم کریں گے تو وہ ہر وقت اپنا مقام دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر کوئی امیر ہے تو سب کو پتا ہے کہ وہ امیر ہے کیونکہ وہ دکھاتا ہے۔ اسی لیے لوگ انارکلی میں خریداری نہیں کرتے، میٹرو بس میں سفر نہیں کرتے اور اردو میں بات نہیں کرتے کیونکہ یہ سب چیزیں غریبوں کے لیے مختص سمجھی جاتی ہیں۔ پاکستان کا تعلیم یافتہ شخص انگریزی میں بات کرتا ہے، جو کہ حیرانی کی بات ہے۔ پاکستانی اپنے ملک پر اتنا فخر کرتے ہیں لیکن اپنی قومی زبان کو مرنے دیتے ہیں، بلکہ مار دیتے ہیں۔ وہ اپنے ملک پر ناز کرتے ہیں لیکن انھیں اپنی زبان بولنے سے، اپنے لباس پہننے سے اور اپنی ثقافت کی وجہ سے شرم آتی ہے۔ وہ لاہور میں، ایک قدیم ترین شہر میں رہتے ہیں، لیکن اندرون شہر کے اندر قدم ہی نہیں رکھتے۔ اور پھر حیران ہوتے ہیں کہ ہم غیر ملکی اندرون شہر کو اتنا پسند کرتے ہیں۔ ہم تو اسی کو دیکھنے آتے ہیں، اپنی مغربی ثقافت کی پاکستانی عکاسی کو تھوڑی دیکھنے آتے ہیں۔

یہ جو دکھاوا اور ایک مقام کے پیچھے بھاگنا ہوتا ہے، وہ میں نے سب سے زیادہ لمز میں دیکھا۔ کچھ طالب

علموں کی نزاکت اور ان کے غرور کو دیکھ کر مجھے اپنے پاکستانی کپڑوں میں میک اپ نہ کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ مگر شروع میں ہی کچھ عرصے بعد مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور میرا احساسِ کمتری ختم ہو گیا تھا۔ اور پھر لمز میں میرا وقت بہت اچھا گذرا۔ مجھے بہت اچھے دوست ملے جن سے میں ابھی بھی رابطہ رکھتی ہوں۔ لمز کی کلاسز اور سرگرمیاں بھی اچھی لگیں۔ اگر فٹ بال کی ٹیم نہ ہوتی تو میرا وقت اتنا اچھا نہ گذرتا۔ پھر رات کو ذاکر کی چکن ہانڈی اور کھوکھے کی چائے ......اور لمز کا جو پی ڈی سی ہے، وہ میری یونی ورسٹی کی کنٹین سے سو گُنا بہتر ہے۔

لمز اچھا لگا لیکن جب بھی موقع ملتا تھا تو میں لمز سے باہر جاتی تھی۔ مجھے لگ رہا ہے کہ لمز سے باہر لوگ فطرت کے زیادہ قریب ہیں۔ شاید کیونکہ اُن کے پاس اِتنا کچھ ہے ہی نہیں دکھانے کے لیے۔ اور پھر لمز واپس آ کر ایک دوسری دنیا نظر آتی ہے۔ عام لوگوں کے مسئلے مسائل سے دور۔ میں اس تفریق کو دیکھ کر اکثر حیران رہ جاتی تھی۔ لمز کے کچھ طالب علم اپنے ڈرائیور کے ساتھ اے سی والی گاڑی میں گھر جاتے ہیں اور دوسری طرف لمز کے ہوسٹل والی ماسیوں کے پاس رکشے کے پیسے نہیں ہوتے اور انھیں دھوپ میں ایک گھنٹا پیدل جانا پڑتا ہے۔

دنیا میں ہر ملک میں دولت کی غیر مساوی تقسیم ہوتی ہے مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ امیروں کو اپنی ایک دنیا بنانی چاہیے جو عام لوگوں کی دنیا سے اس قدر مختلف ہو۔ یہاں پر امیر لوگ ایک بلبلے میں رہتے ہیں اور عام لوگوں کو پاس آنے نہیں دیتے۔ اچھی تعلیم، اچھی نوکریاں، ایک اچھی زندگی...... یہ سب عام لوگوں کے لیے نہیں ہوتا۔ ملازم کو غلام سمجھا جاتا ہے اور ان سے فرق رکھا جاتا ہے۔ بھکاریوں سے تو بالکل بات نہیں کرتے۔ مگر وہ بھی انسان ہیں، کم از کم انھیں عزت تو دے سکتے ہیں اور اچھی طرح سے ادب سے پیش آ سکتے ہیں۔ مجھے غریب ہونے سے زیادہ غلط متکبر ہونا لگتا ہے۔ اگر ہم دنیا کے حالات کو بدلنا چاہتے ہیں، اگر ہم غریبوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں، اگر ہم چاہتے ہیں کہ سب لوگوں کے پاس اچھی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ہو اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں کوئی بھوکا نہ مرے......تو ہمیں سب سے پہلے یہ ماننا پڑے گا کہ ہم ہی اس مسئلے کا ایک بہت بڑا حصہ ہیں۔ ہم اگر لمز میں پڑھ سکتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہم پاکستان یا دنیا کے اونچے طبقے میں شامل ہیں۔ ہم اس بدعنوان سیاسی نظام کا حصہ ہیں اور ہمارے

والدین بھی اس کا حصہ ہیں۔ اگر ہم اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنی ذمہ داری دوسروں پر ڈالتے ہیں، اگر ہم یہ نہیں مانتے کہ ہماری دولت کی بنیاد دوسروں کی غربت پر ہے، تو کچھ نہیں بدلے گا! اگر ہم خود نہیں بدلتے تو دنیا میں تغیر کہاں سے آئے گا؟ میں یہ لکھ کر کسی پر تنقید نہیں کرنا چاہتی، میں نے صرف وہ چیزیں لکھیں جو میں نے دیکھیں ہیں اور جنھوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

لیکن اب میرے سوال کا جواب: پاکستان جانا ضروری کیوں تھا؟

اس لیے کہ میں اب ایک سفیر بن کر اپنے ملک جا کر اپنی خالہ اور دوسرے لوگوں کو پاکستان کی خوبصورتی دِکھا کر اس کا نام روشن کروں۔ اس کے بارے میں لوگوں کے تاثرات بدلوں۔ میں بتا سکوں کہ پاکستان میں بھی انسان ہیں، جنھوں نے مجھے اتنا پیار دیا، جو ہنستے روتے زندگی گذارتے ہیں۔ ایسے انسان جو سکون سے رہنا چاہتے ہیں، جو ظلم اور جنگ کو پسند نہیں کرتے۔ وہ سب ظاہری باتیں ہیں لیکن جب ہم فقط بری خبریں سن کر کسی ملک کا کوئی نقشہ بناتے ہیں تو ہم کبھی بھی سوچ نہیں سکتے کہ اس ملک میں لوگ کیسے رہتے ہوں گے۔ اور پھر ہمیں وہ لوگ مختلف اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ آج کل کے حالات میں اس آسان بات کو سمجھنا بہت اہم ہے۔ کیونکہ تعصب کے ساتھ ساتھ نفرت اور ایک ڈر پیدا ہوتا ہے جو بڑے پیمانے پر آج کل یورپ اور امریکا کی سیاست کا تعین کر رہا ہے۔

(ربیکا ہڈا نک راچ لمز کی سابق طالبہ ہیں)

رپورٹ: زاہد حسن

لمز میں لوہا کُٹ اسٹیج کیا گیا

(یکم دسمبر ۲۰۱۶ء)

یکم دسمبر ۲۰۱۶ء کی شام لمز کے سنٹرل کورٹ یارڈ میں پنجابی ڈراما لوہا کٹ اسٹیج کیا گیا۔ ڈراما دیکھنے کے لیے طلبہ وطالبات کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ لمز میں اسٹیج کیا جانے والا یہ پہلا پنجابی کھیل تھا۔ پنجابی کے نامور ادیب بلونت گارگی کے اس ڈرامے لوہا کٹ کی ایک اپنی تاریخی اہمیت ہے اور اس سے جڑے بعض واقعات بے حد دلچسپی کے حامل ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۴ء میں لکھے جانے والے اس ڈرامے کو گربخش سنگھ نے ''پریت نگر تھیٹر'' میں اس وقت اسٹیج کرنے کی اجازت نہیں دی تاہم بعد ازاں پروفیسر موہن سنگھ نے اسے شائع کیا اور اس کی بڑے پیمانے پر تشہیر ہوئی۔

لوہا کٹ پہلی بار لاہور ریڈیو اسٹیشن سے براڈ کاسٹ ہوا اور کا کو لوہار کا مرکزی کردار اقبال محمد نے ادا کیا۔

اپنے لکھے جانے کے ٹھیک تراسی (۸۳) برس بعد لوہا کٹ کی لمز میں پیش کش اس امر کی غماز ہے کہ نہ صرف اس ڈرامے کی اپنی ایک تخلیقی، ادبی اور معنوی اہمیت ہے بلکہ اس کا موضوع بھی ہمارے عہد کے تناظر میں بامعنی دکھائی دیتا ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ایک بڑی تخلیق زمان ومکان کی قید سے آزاد ہوتی ہے اور مستقبل میں بھی اس سے بہت لُطف لیا اور اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ یوں لمز میں اس ڈرامے کا پیش کیا جانا ایک خوشگوار تاریخی واقعہ تھا۔ ڈرامے کی ہدایات فہیم مظفر نے دیں۔ حصہ لینے والے طلبہ وطالبات کے نام اور کردار کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔ حارث چودھری (کاکو)، ماریہ غفار (بسنتی)، شارق ایوب (گجن)، مہوش سردار (بینو)، شازیہ عاصم

(بینو کا سخت روپ)، مثل گوہر (دیپا)، حسن رضا (کاکو کا دوست: کرما)، اسامہ لالی (کاکو کا دوست: تلوکا)، اسامہ لالی (سپاہی)، محمد حمزہ (کاکو کا دوست: بارو)۔ علاوہ ازیں حلیمہ شہزاد اور حنان اطہر نے تکنیکی میک اپ اور دیگر سہولیات فراہم کیں جب کہ لمز میں پنجابی ادب کی استاد سارہ کاظمی نے اپنی آواز کا جادو جگایا۔

ڈراما اسٹیج کیے جانے کے دوران سامعین کے تاثرات سے پتا چل رہا تھا کہ اُنھیں نہ صرف ڈراما اپنے موضوع، پیش کش، کرداروں کے اپنے اپنے کردار میں ڈوب کر کام کرنے اور واقعات کے اتار چڑھاؤ کے باعث پسند آیا ہے بلکہ ڈرامے نے اُنھیں پوری طرح اپنے گرفت میں بھی لیے رکھا۔ اِس سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ لوگ اور خصوصاً طلبہ و طالبات اس طرح کے ڈرامے دیکھنا چاہتے ہیں، جن میں ان کی زندگی میں شامل لوگوں سے جڑے بے شمار حالات و واقعات کو موضوع بنایا گیا ہو۔

(زاہد حسن لمز میں ریسرچ ایسوسی ایٹ ہیں)

رپورٹ: زاہد حسن

ڈاکٹر سید عبداللہ: ایک صدی، ایک عہد
(۹ دسمبر ۲۰۱۶ء)

گرمانی مرکز زبان و ادب کے زیرِ اہتمام ۹ دسمبر ۲۰۱۶ء کو اُردو کے نامور ادیب، محقق اور نقاد ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے حوالے سے ایک نشست منعقد کی گئی جس کی صدارت جسٹس (ر) جواد ایس خواجہ نے کی۔ کلیدی خطبہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی صاحبزادی عطیہ سیّد نے دیا، جب کہ ڈاکٹر خورشید رضوی اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی شخصیت، فن اور فکر کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر معین نظامی نے سرانجام دیے۔

مقررین نے اپنی گفتگو میں کہا کہ سیّد عبداللہ کی شخصیت بے حد کرشماتی تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جس قدر کام کیا اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے کیریئر کا آغاز پنجاب یونی ورسٹی میں لائبریرین کی حیثیت سے کیا۔ بعدازاں وہ اسی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ وہ ''اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ'' کے سربراہ بھی رہے۔ اسی طرح اگر ان کی تصانیف اور تالیفات کو دیکھا جائے تو معیار اور تعداد دونوں کے اعتبار سے انھوں نے قابلِ قدر کام کیا۔ ان کی تصانیف بالخصوص ادبیاتِ فارسی میں ہندوؤں کا حصّہ، شعراے اُردو کے تذکرے، مسائل اقبال، چند نئے اور پرانے شاعر، سخن ور، نئے اور پرانے، ادب و فن، ملّا و جہی سے عبدالحق تک اور ولی سے اقبالؒ تک قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اُن کی بے شمار تصانیف ہیں۔

عطیہ سید نے اپنی گفتگو میں گُرمانی مرکز زبان وادب کے منتظمین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ لاہور میں بلکہ میں تو کہوں گی کہ پاکستان میں کوئی ایک ادارہ تو ایسا ہے جس نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آج اس بھرپور شام کا اہتمام کیا۔ انھوں نے سیّد عبداللہ کے والد اور گھر کے سربراہ کے طور پر کردار کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ وہ پیشہ ورانہ اعتبار سے بہت مصروف رہتے تھے، تاہم وہ گھر کو بھی پورا پورا وقت دیا کرتے۔ عطیہ سیّد نے کہا کہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے ہماری تعلیم وتربیت پر خاص توجہ مبذول رکھی اور ہمیں اب بھی یوں محسوس ہوتا کہ جیسے وہ ہر وقت ہمارے ساتھ ہیں۔

ڈاکٹر خورشید رضوی نے بطور اُستاد ان کے کردار کو سراہا اور کہا کہ اُن کا تعلّق اپنے شاگردوں کے ساتھ کبھی استادوالا نہیں رہا۔ وہ ایک بڑے بزرگ کی مانند ایک اچھے دوست کا احساس دلاتے رہتے تھے۔

جسٹس (ر) جواد ایس خواجہ نے اردو زبان کے حوالے سے اُن کی خدمات کو بے حد سراہا اور کہا کہ کم ہی لوگ ہوں گے جنھوں نے اردو زبان وادب کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ اُن معدودے چند افراد میں سے ایک تھے۔

پروفیسر معین نظامی نے کہا کہ بنیادی طور پر گرمانی مرکزِ زبان وادب کے تحت اس محفل کا مقصد ہی یہ تھا کہ ہم سیّد عبداللہ جیسی نامور شخصیات کی خدمات کو نہ صرف یاد کریں بلکہ اپنی آنے والی نسل تک بھی پہنچائیں۔ انھوں نے کہا کہ میرے خیال میں آج کی یہ تقریب اور اس میں نوجوان نسل کی شمولیت ہمارے اس مقصد کو بہت حد تک پورا کرتا دکھائی دیتی ہے۔

(زاہد حسن لمز میں ریسرچ ایسوسی ایٹ ہیں)

رپورٹ: ذیشان دانش خان

گرمانی مرکز زبان وادب کے زیرِ اہتمام سہ روزہ صوفی کانفرنس
(۱۲ - ۱۴/ اپریل ۲۰۱۷ء)

لاہور یونی ورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز میں گرمانی مرکزِ زبان وادب کے زیرِ اہتمام ''جنوبی ایشیا میں تصوّف'' کے عنوان سے تین روزہ صوفی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ ۱۲/ اپریل ۲۰۱۷ء کی شام Duke University کے پروفیسر بروس لارنس (Bruce Lawrence) کے لیکچر کے ساتھ شروع ہونے والی یہ کانفرنس ۱۴/ اپریل کی رات تک جاری رہی۔ اس دوران ۱۳/ اپریل کی رات قوالی کی محفل بھی ہوئی جس میں پاکستان کے مشہور قوال اُستاد فرید ایاز اور ان کے ساتھیوں نے اپنے جوہر دکھائے۔

۱۳ اور ۱۴/ اپریل کو ہونے والی اس کانفرنس میں پندرہ کے قریب مقالات پیش کیے گیے۔ ۱۳/ اپریل کی صبح گرمانی مرکزِ زبان وادب کے ڈائریکٹر، پروفیسر معین نظامی نے افتتاحی کلمات کے ساتھ کانفرنس کا آغاز کیا۔ اس کے بعد جمال الیاس (University of Pennsylvania)، سارہ عبداللہ (LUMS)، تنویر انجم (Quaid-i-Azam University)، امینہ واصف (Lahore College for Women University)، نوشین علی (Aga Khan University, Karachi)، آمنہ یقین (SOAS, University of London)، شہزاد بشیر (Stanford University)، سارہ کاظمی (LUMS) نے تصوف اور صوفی ازم سے متعلق موضوعات پر بات چیت کی۔ اس دوران سوال وجواب کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

۱۴/ اپریل کی صبح دس بجے کانفرنس کا دوبارہ آغاز کیا گیا۔ لوکاس ورنر (LUMS)، عفت بتول

علی عثمان قاسمی (Journalist and Author)، ہارون خالد (Government College University)، شہوار کبریا (Government Postgraduate College, Bahawalpur)، رفیق الاسلام (LUMS)، سلمیٰ (Jawaharlal Nehru University)، شیبا سعید (Institute of Business and Administration)، صدیقی (Freie Universitat Berlin)، ٹونی سٹیورٹ (Vanderbilt University) نے اس موضوع پر گفتگو کی اور اپنے پُرمغز مقالے پیش کیے۔

مقالہ نگاروں اور شرکا نے اظہارِ خیال کیا کہ ایسی کانفرنسیں ملک میں بڑھتے ہوئے دہشت گردی کے رجحانات، فرقہ واریت، عصبیت اور نفرت کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔ ایسی تقریبات کے ذریعے لوگوں میں محبت، امن اور بھائی چارے کی فضا کو فروغ ملے گا۔ پاکستان میں آباد مختلف ثقافتیں اور زبانیں رکھنے والے لوگ ایک دوسرے کی زبانوں، اقدار، کلچر اور آرٹ کو سمجھیں گے اور یوں ان کے مابین قربت بڑھنے کے امکانات روشن ہوں گے۔

پروفیسر معین نظامی نے کانفرنس کے آغاز میں جرمنی اور امریکا سمیت مقامی دانشوروں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جب تصوف اور صوفی ازم جیسے اہم موضوعات پر بات چیت ہوگی' اور اس کا آغاز یونی ورسٹیوں اور کالجوں سے ہوگا' تو اس بیانیے کے اثرات دوررس اور دیرپا ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ خاص طور پر موجودہ نسل کو اسلام کی روحانی قدروں سے آشنا کروانے کی ضرورت ہے تاکہ آپس میں رواداری اور بھائی چارے کی یہ ریت اور روایت پھلتی پھولتی رہے۔

(ذیشان دانش خان لمز میں ریسرچ ایسوسی ایٹ ہیں)

رپورٹ: زاہد حسن

شعری تجربہ: ممتاز شاعرہ یاسمین حمید کا لیکچر
(۲۲/اپریل ۲۰۱۷ء)

یاسمین حمید منفرد لب و لہجے کی شاعرہ ہیں۔ وہ اپنی شاعری کے حوالے سے اردو دنیا میں معروف ہیں۔ پسِ آئینہ ، فنا بھی ایک سراب ،حصار بے در و دیوار اور بے ثمر پیڑوں کی خواهش کے نام سے اُن کے شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے اردو کے منتخب شعرا کا کلام انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ نیـــا اردو افســانــہ کے نام سے گرمانی مرکزِ زبان و ادب کی طرف سے بھی اُن کی مرتب کردہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ وہ گرمانی مرکزِ زبان و ادب کی ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دیتی رہی ہیں۔

۲۲/اپریل ۲۰۱۷ء کو انھوں نے اردو کورس بعنوان An Introduction to Urdu Literature کے طلبہ و طالبات سے شعری تجربے اور تخلیقی عمل کے حوالے سے بھرپور گفتگو کی۔ انھوں نے شعر و ادب میں تخلیقی عمل اور تخلیقی تجربے کی اہمیت، تخلیق میں اس کی حیثیت اور اس واردات کے حوالے سے وسیع تر تناظر میں بات کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی لکھنے والے کے یہاں اس کے شعری و تخلیقی تجربے کی حیثیت بنیادی بنتی ہے۔ اگرچہ ہر لکھنے والے کے یہاں اس میں انفرادیت نظر آتی ہے جس کا سبب اس کی اپنی زبان کا کلاسیکی ورثہ، اس کا جغرافیہ، تہذیب و ثقافت اور بذاتِ خود زبان کا بھی اپنا کردار ہوتا ہے۔ اس تجربے کو ہمیشہ معاصر اور جدید ادب کے تجزیے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس سے خاطر خواہ نتائج حاصل کیے جاتے ہیں۔ دراصل شعری تجربہ بھی زمان و مکان سے ماورا عمل ہے جسے دنیا کے ہر کونے میں رہنے والا شاعر ادیب برابر سطح پر محسوس کر سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کے حوالے سے بھی تخلیقی عمل

اور تخلیقی تجربے کے تناظر میں گفتگو کی اور بتایا کہ وہ جب شعر کہہ رہی ہوتی ہیں تو اس تجربے کی نوعیت علاحدہ ہوتی ہے جب کہ ترجمے یا تنقیدی عمل کے دوران اس کی نوعیت کچھ اور طرح کی ہوتی ہے۔

طلبا و طالبات نے اس گفتگو کو سراہا اور اپنے سوالات کے ذریعے بعض نئے نکات کی طرف متوجہ کیا۔ آخر میں یاسمین حمید صاحبہ نے اپنا کلام بھی سنایا۔

(زاہد حسن لمز میں ریسرچ ایسوسی ایٹ ہیں)

رپورٹ: زاہد حسن

گرمانی مرکز زبان و ادب کے حلقۂ دانش کے زیرِ اہتمام پنجابی صوفی شعرا پر لیکچر سیریز

(۳ فروری تا ۵ مئی ۲۰۱۷ء)

پنجابی شاعری کی روایت بہت قدیم ہے۔ اس میں موجود لوک شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو پتا چلے گا اس کا سلسلہ صدیوں کو محیط ہے۔ اس خطّے میں موجود انسان نے جب اپنے لطیف احساسات کا اظہار کرنا شروع کیا تو اس مقصد کے لیے اس نے شاعری تخلیق کی۔ یوں لگتا ہے کہ عورت کی طرف سے کیا گیا اظہار اپنے اندر خالص محبت، اظہار کی شدت اور وارفتگی رکھتا تھا جس کی نشانیاں آج کی شاعری میں تو ملتی ہی ہیں، صوفی شعرا کے ہاں بھی اس کا اظہار بہت عمدگی کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ مشرق و مغرب میں پنجابی صوفی شاعری کا ڈنکا بج رہا ہے اور پوری دنیا اس کی معترف ہے۔ ملکی سطح پر قومی زبانوں اور ان میں لکھے گئے ادب اور شاعری کو فروغ دینے کے لیے جس طرح کی کوشش ہونا چاہیے تھی، اس کی کمی نظر آتی ہے۔ تاہم ایسی صورتِ حال میں بھی بعض تعلیمی ادارے ایسے ہیں جو پنجابی زبان اور اس میں موجود شعری ادب اور اس کے تہذیبی و ثقافتی ورثے سے کما حقہٗ آگہی رکھتے ہیں اور اس کے فروغ کے لیے مصروفِ عمل ہیں۔ لمز (لاہور یونی ورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز) بھی ایک ایسا تعلیمی ادارہ ہے جو پوری دنیا میں اپنا علاحدہ مقام اور منفرد پہچان رکھتا ہے۔ اس میں موجود ''گرمانی مرکزِ زبان و ادب'' میں ایک طرف جہاں پاکستان کی مختلف زبانوں میں تعلیم کا سلسلہ جاری ہے، وہیں پچھلے سمیسٹر کے دوران ''حلقۂ دانش'' کے زیرِ اہتمام ''پنجابی صوفی شعرا'' کے حوالے سے ایک لیکچر سیریز کا اہتمام کیا گیا۔ ۳ فروری ۲۰۱۷ء سے شروع ہونے والی یہ سیریز معمولی وقفوں کے

ساتھ ۵ مئی ۲۰۱۷ء تک جاری رہی۔ ۳ فروری کو ہونے والے پہلے لیکچر میں موضوع کی اہمیت اور انتخاب کے حوالے سے بات چیت کی گئی۔ مقررین میں مشتاق صوفی اور معین نظامی شامل تھے۔ مشتاق صوفی پنجابی زبان وادب کی ایک ایسی اہم اور نمایاں شخصیت ہیں جو پنجابی کے صاحبِ اسلوب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک محقق، مترجم اور نقاد بھی ہیں۔ وہ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے صدر ہیں اور روز نامہ ڈان میں ''پنجابی نوٹس'' کے نام سے کالم لکھتے ہیں۔ معین نظامی گرمانی مرکزِ زبان وادب میں ڈائریکٹر ہیں۔ انھی کی مساعی سے یہ خوبصورت پروگرام ممکن ہوا۔ وہ پنجابی، اُردو اور فارسی کے شاعر، مترجم اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ تصوف اور صوفی شاعری سے بھی گہرا تعلّق رکھتے ہیں۔ اپنی گفتگو میں معین نظامی صاحب نے بتایا کہ یوں تو گاہے بہ گاہے پنجابی شاعری اور تصوف پر پروگرامز کا انعقاد ہوتا رہتا ہے تاہم پہلی بار باقاعدہ طور پر ایک سیریز کا آغاز کیا جا رہا ہے جس میں پنجابی صوفی شاعری کی اہمیت کے علاوہ بابا فریدؒ، شاہ حسینؒ، سلطان باہوؒ، بُلھے شاہ، وارث شاہ، میاں محمد بخش اور خواجہ غلام فریدؒ کی شاعری، شخصیت اور فن پر گفتگو کی جائے گی۔ مزید یہ کہ سوال و جواب کا وقفہ بھی رکھا جائے گا اور عارفانہ کلام کی گائیکی کا بھی پروگرام ہوگا۔

مشتاق صوفی نے کہا کہ ہمارے اِن صوفی شعرا نے پنجاب کی تہذیب، زبان اور سماجی رویوں کو ہی اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا بلکہ طبقاتی تقسیم، استحصال اور ظلم کے خلاف لکھا۔ انھوں نے عام لوگوں میں رچ بس کر زندگی گذاری اور انھی کی اقدار اور زندگی کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذات اور پیغام آج تک نہ صرف موجود ہیں بلکہ انسانی قدروں اور رویوں کو سمجھنے میں رہنمائی بھی دیتے ہیں۔

پنجابی کے سب سے اہم اور بڑے صوفی شاعر بابا فریدؒ کو نو سو برس سے اوپر عرصہ گذر چکا ہے تاہم آج بھی اُن کا نام اور کلام زندہ ہے۔ اور جب تک انسانی قدروں اور انسانی محبتوں کا چلن باقی رہے گا، ان صوفیا کے کلام کی تاثیر ہمارے ذہنوں اور سینوں کو گرماتی اور جگمگاتی رہے گی۔

۱۰ فروری ۲۰۱۷ء کو بابا فریدؒ کی شاعری کے حوالے سے بات کرتے ہوئے معروف دانشور اور پـنـچـم کے مدیر مقصود ثاقب نے کہا، بابا فریدؒ پنجابی صوفی شاعری میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کا شمار پنجابی صوفی شاعری کے ان معماروں میں ہوتا ہے جن کی تعلیمات اور شاعری کے اثرات موجودہ زمانے میں بھی نظر آتے ہیں۔ بابا فرید کا کلام

ہم تک گرنتھ صاحب کے ذریعے پہنچا۔اس لیےان کے کلام کی عظمت اورافادیت محض مسلمانوں تک ہی محدود نہیں بلکہ سکھ مت میں بھی مانا جاتا ہے۔انھوں نے بابا فریدؒ کی شاعری کو سمجھنے کے لیے کچھ کتابوں کی نشان دہی بھی کی جن میں خلیق نظامی کی کتاب کے علاوہ پریتم سنگھ کی سری گورو گرنتھ بارے شیخ فرید اور بلونت سنگھ آنند کی کتاب بابا فرید: تعلیمات اور جیون بھی اہم کتابیں ہیں۔بابا فریدؒ کی سوچ اورفکر کو سمجھنے کے لیےان دونوں کتابوں کا پڑھنا بہت ضروری ہے۔اس پروگرام کے دوران طلبہ اوردیگر حاضرین کی طرف سے ہونے والے سوالات سے جو باتیں اُبھر کر سامنے آئیں ان سے ایک تو یہ پتا چلا کہ نئی نسل کوصوفی شاعری میں موجود دانش اورآفاقی سچائیوں سے خوب آگاہی ہے۔جب کہ دوسری بات یہ سامنے آئی کہ نئی نسل ایک بار پھر سے اپنی تہذیب اور ورثے کے ساتھ جڑنا چاہتی ہے۔

۱۷فروری ۲۰۱۷ءکو عظیم صوفی شاعر شاہ حسینؒ کے حوالے سے لیکچر کا اہتمام کیا گیا تھا۔یہ لیکچر پنجاب یونی ورسٹی کے شعبۂ پنجابی کی اُستاد، محقق اوردانشور ڈاکٹر نبیلہ رحمٰن نے دیا۔ان کا کہنا تھا کہ پنجابی کےصوفی شعری ورثے میں شاہ حسینؒ کا نام،کلام اورفکر کا مقام بہت اونچا ہے۔شاہ حسینؒ کو دنیا سے رخصت ہوئے چار سو برس کے قریب زمانہ گذر چکا ہے لیکن ان کی شاعری میں موجود پیغام آج بھی اُسی طرح کامل اور متاثر کن ہے۔اُنھوں نے جہاں ایک طرف اپنی شاعری کوانسان کے ابدی دکھ کے گداز سے بھرپور کیا وہاں پرایک خوب صورت علامتی نظام بھی وضع کیا جو سارے کا سارا چرخے کے گرد گھومتا ہے۔چرخے کے سارے حصوں کوانھوں نے اپنی کافیوں میں یوں پرویا ہے کہ کسی قسم کی غرابت یا دوئی محسوس نہیں ہوتی۔

کچھ تھوڑے سے وقفے کے بعد ۳۱ مارچ ۲۰۱۷ءکواس سلسلے کی دوبارہ سے شروعات پنجابی صوفی شاعری کی گائیکی سے ہوئی جس میں سارہ کاظمی، ہماصفدر اور شفقت حسین نے حصّہ لیا۔ بابا فریدؒ،شاہ حسینؒ، وارث شاہؒ اور سلطان باہوؒ کے کلام کوخوبصورت طریقے سے گایا گیا اور ساتھ ہی ساتھ کلام کی تشریح بھی کی گئی۔ پروگرام میں حاضرین کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی،خاص طور پر گائیکی کو بے حد سراہا گیا۔

۷ اپریل ۲۰۱۷ءکوسلطان باہو پراحمد سعید ہمدانی نے گفتگو کی۔احمد سعید ہمدانی نے سلطان باہوؒ کی شاعری

اور شخصیت کے حوالے سے بہت زیادہ کام کر رکھا ہے۔ وہ احوال و مقامات حضرت سلطان باہو سمیت کئی کتب کے بھی مصنف ہیں۔ انھوں نے اپنے لیکچر کو دو حصوں میں بانٹا۔ پہلے حصے میں انھوں نے سلطان باہو کی ذاتی زندگی اور ان کے خاندانی پس منظر پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ سلطان باہوؒ کی زندگی کو جاننے کے لیے صاحبزادہ حامد سلطان کی کتاب مناقبِ سلطانی کا مطالعہ کرنے کی اشد ضرورت ہے، جس کے ذریعے حضرت سلطان باہوؒ کی شاعری، فکر و فن اور شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ سلطان باہوؒ کے دادا کا مزار خوشاب کے مشہور قصبہ 'انگہ' میں موجود ہے۔ اُن کے والد بازید محمد مغلوں کی فوج میں بھرتی تھے۔ سلطان باہوؒ کی عمر محض تین چار برس ہی تھی کہ ان کے والد کی وفات ہوگئی۔ اس کے بعد ان کی تعلیم و تربیت اُن کی والدہ محترمہ نے کی جو بے حد محنتی، متقی اور زاہدہ و عابدہ خاتون تھیں۔ آپ کی زندگی پر آپ کی والدہ کی شخصیت کے بہت اثرات تھے۔ آپ نے فارسی نثر میں بھی کتب تصنیف کیں، تاہم جس شے نے آپ کو دائمی شہرت اور عزت دی وہ آپ کے وہ پنجابی بیت ہیں جن میں معرفتِ خدا کے ساتھ ساتھ دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کے حوالے سے بھی خوبصورت تصورات پیش کیے گئے ہیں۔ پروگرام کی نظامت معین نظامی نے کی جب کہ شرکا میں چیف جسٹس (ر) جواد ایس خواجہ بھی شامل تھے۔

۱۴/ اپریل ۲۰۱۷ء کو بلھے شاہ کے حوالے سے اقبال قیصر نے لیکچر دیا۔ اقبال قیصر پچھلے کئی برس سے پنجابی زبان و ادب کے ساتھ وابستہ ہیں۔ انھوں نے پنجابی زبان و ادب اور تواریخ کے حوالے سے اور بہت سا کام کرنے کے علاوہ پاکستانی پنجاب میں سکھوں کے مقدس مقامات کے بارے میں بھی بہت کام کیا ہے۔ انھوں نے بُلھے شاہ کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ بلھے شاہؒ ہماری پنجابی صوفی شاعری کے نمایاں اور منفرد شاعر ہیں۔ جو بے باک انداز اور جراتِ اظہار اُن کے ہاں ملتی ہے ہمیں کسی دوسرے صوفی شاعر کے ہاں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے وقت کے سیاسی اور سماجی حالات کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا اور اس عہد کی گھٹن اور جبر سے بھری فضا میں حق بات کی۔ اس پروگرام میں سید بابر علی صاحب نے بھی شرکت فرمائی۔

۲۱/ اپریل ۲۰۱۷ء کو سید وارث شاہ کے حوالے سے لیکچر کا اہتمام کیا گیا جس میں شعبۂ پنجابی، پنجاب یونی ورسٹی کے استاد پروفیسر سعید بھٹا نے حاضرین سے وارث شاہ کی زندگی اور شاعری کے حوالے سے بات چیت کی اور خاص

طور پر ان کی شان دار تخلیق ہیـــر کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انھوں بتایا کہ باوجود اس کے کہ ہیر کا یہ قصّہ اس عہد کے نامی گرامی فارسی اور دیگر زبانوں کے شعرا نے لکھا، وارث شاہ کے لکھے ہوئے قصّے کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جو انھیں پنجابی میں دمودر داس گلاٹی، شاہ جہان مقبل اور احمد گوجر سمیت سب شعرا سے نمایاں کرتی ہیں اور انھیں ایک منفرد شاعر کے طور پر ہمارے سامنے لاتی ہیں۔ انھوں نے ہیـر وارث شـاہ میں سے کچھ حصے بھی پڑھ کر سُنائے اور ان پر سیر حاصل گفتگو کی۔

مثنوی سفرا لعشق المعروف بہ سیف الملوك کے بے مثال شاعر میاں محمد بخش پر لیکچر پروفیسر معین نظامی نے دیا۔ یہ لیکچر ۱۲۸اپریل ۲۰۱۷ء کولمز لائبریری میں ہی ہوا۔ سیف الــمـلـوك کو پنجابی بولنے اور پنجابی سے محبت کرنے والوں میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہے۔ پروفیسر معین نظامی نے اپنے لیکچر کو پانچ حصوں میں بانٹا جس میں انھوں نے میاں محمد بخشؒ کے خاندانی پس منظر، ان کی تعلیم وتربیّت، سجادگی، دیگر تخلیقات اور مثنوی سـفـر العشق پر بالخصوص تفصیلاً گفتگو کی۔ انھوں نے بتایا کہ یہ مثنوی میاں صاحب نے محض تینتیس (۳۳) برس کی عمر میں تخلیق کی جو ان کی اپنی تخلیقات میں ہی نہیں بلکہ پنجابی شعری ادب کی تاریخ میں نمایاں تسلیم کی جاتی ہے۔ اسے پڑھنے، یاد کرنے اور موقع محل کی مناسبت سے اس میں سے فی البدیہہ اشعار پیش کرنے والے لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ بظاہر یہ ایک عاشقانہ داستان ہے تاہم اس میں اخلاقی اور عرفانی نکات بھی ملتے ہیں۔ اسے ایک عام کہانی سے بڑھ کر راہِ تصوف کی راہنما کتاب مانا جاتا ہے۔ اس کے بے شمار اشعار آج بھی ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ عربی داستانوی ادب کے کلاسیکی شاہکار الف لیـلـہ ولیـلـہ کی کہانیوں میں سے ایک کہانی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔

۵مئی ۲۰۱۷ء کو پنجابی صوفی شعرا کی لیکچر سیریز کا آخری پروگرام خواجہ غلام فریدؒ کے حوالے سے ہوا جس میں مشتاق صوفی نے گفتگو کی۔ انھوں نے بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ عام طور پر کلاسیکی شعرا اور ان کی شاعری کے بارے میں جب کتب اور دواوین کو سند بنایا جاتا ہے تو دیکھا جاتا ہے کہ اس شاعری کو کھوجنے والا، مرتّب کرنے والا اور اسے حتمی صورت میں پیش کرنے والا کون تھا۔ خواجہ صاحب کے بھی جس دیوان کو بنیاد بنایا جاتا ہے وہ عزیز الرحمٰن کا

مرتب کردہ دیوان فریدؒ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادبی حلقوں میں اسے بہت حد تک استناد حاصل ہے۔ ایسے ہی خواجہ صاحب کی زندگی اور اُن کے روزمرہ معاملات کو سمجھنے کے لیے اُن کے ایک مرید کی مرتب کی ہوئی کتاب مقابیس المجالس کا مطالعہ بھی مفید رہے گا جس میں خواجہ صاحب کے روزمرہ معمولات کا اندراج ہے مشتاق صوفی نے خواجہ غلام فریدؒ کی شاعری کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا کہ بنیادی طور پر اُن کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصّہ وہ ہے جس میں تصوف اور وحدت الوجودی معاملات پر مشتمل شاعری ہے جس پر بہت سے لوگوں نے لکھا ہے۔ جب کہ اُن کی شاعری کا دوسرا حصہ عشق اور روہی کے رنگوں سے رچا ہوا ہے جس میں تھل مارو، وہاں کے لوگ، ان کا تہذیب وتمدّن، اور وہاں اُگنے والے درختوں، جڑی بوٹیوں اور جانوروں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ خواجہ صاحب کی شاعری کے اس دوسرے حصّے سے ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ اُنھیں اپنے وطن، اس کے لوگوں اور وہاں موجود ہر ایک شے سے کس قدر محبت ہے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ اگرچہ خواجہ غلام فریدؒ کی شاعری اور ان کے فکر وفن پر بہت زیادہ کام ہو چکا ہے تاہم ابھی اور زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔

یوں ۳ فروری ۲۰۱۷ء سے شروع ہونے والی پنجابی صوفی شعرا کے حوالے سے یہ لیکچر سیریز کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی جس میں ہر لیکچر میں ہونے والی پُرمغز باتوں سے شرکا خاص طور پر طلبہ وطالبات نے بھرپور استفادہ کیا۔ طلبہ کے سوالات اس بات کا پتا دیتے تھے کہ انھیں پنجابی صوفی شاعری سے گہرا لگاؤ ہے اور وہ اپنے صوفی شعرا، ان کی شاعری اور فکر سے محبت کرتے ہیں۔ یہ لیکچرز دراصل اپنے کلاسیکی ورثے سے نوجوان نسل کے بارِ دگر رشتہ قائم کرنے کا باعث بنے۔ گرمانی مرکز زبان وادب، لاہور یونی ورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز کے اس اقدام کو نہایت احسن اور قابل ستائش قرار دیا جانا چاہیے۔

(زاہد حسن لمز میں ریسرچ ایسوسی ایٹ ہیں)

سردار علی حسن

حاجی عبدالقیوم کاکڑ کے ساتھ ایک نشست

عبدالقیوم کاکڑ کا تعلق صوبہ بلوچستان کے ایک دُور اُفتادہ علاقے سے ہے۔ وہ پچھلے سال پہلی مرتبہ لاہور آئے اور اُن کا لاہور آنے کا واحد مقصد جسٹس (ر) جواد ایس خواجہ سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ آف پاکستان سے ملاقات کر کے اُن کو اُردو زبان کو سرکاری زبان بنانے کے عظیم فیصلے پر خراجِ عقیدت پیش کرنا تھا۔ جسٹس (ر) جواد ایس خواجہ آج کل لمز کے مشتاق احمد گرمانی سکول آف سوشل سائنسز سے وابستہ ہیں۔ عبدالقیوم کاکڑ نے یہ بتایا کہ کس طرح اُردو زبان کو سرکاری زبان بنانے کے تاریخ ساز فیصلے نے پاکستان کے دُور اُفتادہ علاقوں میں بسنے والے کروڑوں لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کر دی ہیں جو انگریزی زبان سے بالکل نابلد ہیں۔ عبدالقیوم کاکڑ نے ایک پسماندہ ترین علاقے کے نمائندے کی حیثیت سے اس عدالتی فیصلے پر جن تاثرات کا اظہار کیا اُن کو ریکارڈ کر لیا گیا تھا۔ اس گفتگو کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے یہاں تحریری شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

س: آپ کے نزدیک عدالت کیا ہے؟

ج: ویسے تو شرعی حوالے سے بھی عدلیہ کا ایک بہت بڑا مقام اور احترام ہے۔ عدلیہ تو مظلوم، غریب اور لاچار آدمیوں کے لیے ایک آسرا ہوتی ہے کہ کہیں بھی کسی کے ساتھ کوئی ظلم ہوتا ہو، کسی کا حق مارا جاتا ہو، کسی کے ساتھ کچھ ناجائز ہوتا ہو تو غریب اور مظلوم آدمی کے لیے عدلیہ کا ایک دروازہ ہوتا ہے جو وہ کھٹکھٹاتا ہے۔

ان کو یہ یقین ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ جو ظلم ہوا ہے، ناانصافی ہوئی ہے، اُس کا تدارک وہاں سے ممکن ہے اور اس طرح عدلیہ کا ہمارے معاشرے میں اسلامی حوالے سے، شرعی حوالے سے اور قانونی حوالے سے ایک بہت بڑا مقام ہے جس پر لوگوں کا اعتماد ہے۔

س: آپ کو لگتا ہے کہ پاکستان میں عدلیہ، جو باتیں آپ کر رہے ہیں، اس پر پورا اُترتی ہے؟

ج: اس وقت ظاہر ہے حالات تو تبدیل ہو چکے ہیں لیکن عدلیہ کا قیام جس بنیاد پر ہوا ہے، اُس حوالے سے تو کما حقہ حق ادا نہیں ہو رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اگر اس طریقے سے عدلیہ اپنا کردار ادا کرے تو اس ملک میں یقیناً انصاف بھی آسکتا ہے۔ اس حوالے سے بہر حال کچھ خامیاں یا کچھ کمزوریاں یا حالات کے مطابق کچھ نہ کچھ اس میں کمزوری آگئی ہے۔ بہر حال پھر بھی عدلیہ پر اعتماد کرنا چاہیے اور اس کے لیے کوشش کرنی چاہیے کہ عدلیہ عوام کے اعتماد پر پوری اُترے اور اس حوالے سے ہمیں بھی دعا اور جدوجہد کرنی چاہیے۔

س: ایک عام شہری کی حیثیت سے آپ کے خیال میں کیا تبدیلیاں ہونی چاہئیں جس سے عدلیہ کا نظام ٹھیک ہو جائے، آپ کو کمزوریاں کیا نظر آتی ہیں اس نظام میں؟

ج: مسئلہ اس میں یہ ہے کہ چونکہ ہمارے ملک میں ہماری قومی زبان اردو ہے۔ عام شہری کے لیے بہتر بات تو یہی ہوتی کہ ہمارا نظام اور عدلیہ کا نظام اردو میں ہو جاتا تا کہ ایک شہری خود جا کر اپنا مدعا پیش کرتا اور اس حوالے سے اس کو سمجھ آجاتا کہ جج اس کے بارے میں کیا کہہ رہا ہے اور فریق یا وکیل کیا کہہ رہے ہیں۔

ہم ایک ہی طبقے کے لوگ ہیں لیکن ہمارے مابین زبان کا فرق ہونے کی وجہ سے مَیں ان کی زبان نہیں سمجھتا ہوں۔ وہ تو سمجھتا ہے یا نہیں سمجھتا لیکن عام شہری اس کی زبان کو نہیں سمجھتا، کیونکہ اجنبی زبان ہے، کسی اور کی زبان ہے۔ قومی حوالے سے ہماری زبان اردو ہے اور آئین کے مطابق بھی ہماری زبان اردو ہے۔ اردو ہمارے عدالتی اور سرکاری دفاتر کی زبان ہو جائے تو بہت سارے معاملات کی پیچیدگیاں ختم ہو سکتی ہیں۔

مَیں تو پڑھتا رہتا ہوں اردو اخبارات کی حَد تک کیوں کہ مَیں اردو زبان جانتا ہوں۔ ایک دن مجھے بہت خوشی ہوئی جب ہمارے چیف جسٹس جواد ایس خواجہ نے اردو زبان کے بارے میں ۸ ستمبر ۲۰۱۵ء کو ایک

تاریخی فیصلہ دیا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ پاکستانی عوام کے دل کی آواز تھی اور پوری قوم کے لیے انتہائی خوش خبری کی بات تھی کہ جج صاحب نے، سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی حیثیت سے، یہ آرڈر کر دیا کہ تین ماہ کے اندر اندر ملک کا سرکاری اور دفتری بول چال کا نظام اردو میں ہونا چاہیے۔ جس علاقے سے مَیں تعلق رکھتا ہوں، مطلب ایک انتہائی دُور اُفتادہ علاقے سے آیا ہوں، وہاں لوگوں نے جو خوشی محسوس کی ہے اور ہمارے صوبے میں الحمدللہ جج صاحب کے آرڈر کے بعد اس پر بہت زیادہ کام شروع ہوا ہے۔ آدھا سفر ہم تقریباً طے کر چکے ہیں، اور ان شاءاللہ مجھے امید ہے کہ ہمارے صوبے کے چیف سیکرٹری صاحب نے اور صوبائی اسمبلی نے، ہمارے دیگر اداروں نے اس پر کام شروع کر دیا ہے، حتیٰ کہ بلوچستان ہائی کورٹ کی ویب سائٹ کا بھی اردو میں آغاز ہو چکا ہے۔ ہم بلوچستان والے انتہائی خوش قسمت لوگ ہیں کہ جج صاحب کے فیصلے کے بعد ہمارے صوبے نے اردو پر کافی حد تک کام کیا ہے اور مزید کر رہا ہے۔

واقعی اردو رابطے کی زبان ہے، آسان زبان ہے اور اس زبان میں، مَیں بتاؤں کہ ہر زبان کے کچھ نہ کچھ الفاظ آپ کو ملیں گے، پشتو کے، براہوی کے، فارسی کے، بلوچی کے، ہر زبان کے۔ اس کو لشکری زبان بولتے ہیں۔ ہمیں بہت خوشی ہے اور پوری بلوچی قوم جج صاحب کو دعا دے رہی ہے اور خاص کر مدارس میں، مجھے دیگر صوبوں کا تو پتا نہیں لیکن ہمارے جو دینی مدارس ہیں، مساجد ہیں، جن میں بچے سبق پڑھتے ہیں، طلبہ سبق پڑھتے ہیں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں، اس کا نظامِ تعلیم اردو میں ہے۔ مَیں کہتا ہوں کہ جج صاحب کو وہاں سے بھی دعائیں آ رہی ہیں اور مَیں یقین سے کہتا ہوں کہ ہمارے بلوچستان میں فزکس ہے، کیمسٹری ہے، بیالوجی ہے، معاشرتی علوم ہے، اردو ہے، ان میں ہمارے بچے پاس ہوتے تھے لیکن مار کھاتے تھے انگلش میں۔ اس میں ہمارے بچے فیل ہو جاتے تھے۔ اب اگر اللہ نے یہ کرم کیا کہ ہمارا تعلیمی نظام اردو میں ہو گیا تو ان شاءاللہ ہمارے جو دُور اُفتادہ علاقے ہیں ان میں بسنے والے بچوں میں یہ صلاحیت ہے کہ آگے تک جا سکیں گے۔ ایک آخری واقعہ جو میں آپ کو سناتا ہوں، یہ ہے کہ ہمارے بلوچستان میں کوئٹہ کے قریب محمد خان اچکزئی کا ایک علاقہ ہے، اس میں ایک نوجوان اعصام اللہ تھا، اس نے پورے

پاکستان میں پہلا نمبر لیا اور برطانیہ میں اسکالرشپ پر پڑھا اور وہ ایک ٹاٹ والے اسکول میں پڑھتا تھا۔ زمین پر بیٹھ کر پڑھنے والے نوجوان نے یہ کر دکھایا۔ تو مَیں کہتا ہوں کہ بلوچستان کے لوگ بہت زیادہ ذہین ہیں۔ جج صاحب کو ہم بہت زیادہ دعائیں دیتے ہیں کہ انھوں نے ایک تاریخی فیصلہ دیا ہے۔

(سردار علی حسن لمز میں ریسرچ اسسٹنٹ ہیں)

NUMŪD

Annual Students' Magazine

Volume 6, 2017

LUMS

Gurmani Centre for Languages and Literature
Lahore University of Management Sciences
Opposite Sector 'U' DHA Lahore Cantt 54792, Pakistan
UAN: +92-42-111-115-867 ; Email: numud@lums.edu.pk